جلد ۸۰ | نومبر ۱۹۷۳ء | عدد ۳

ماھنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

ابوالاعلیٰ مودودی

ادارۂ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

مولانا مودودی کی تصانیف کا مکمّل سیٹ (اُردو)

نمبر شمار	نام کتاب	اعلیٰ ایڈیشن (روپے پیسے)	سستا ایڈیشن (روپے پیسے)
۱	قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں	۳،۲۵	.. ..
۲	سرورِ عالمؐ	..،۹۰	.. ..
۳	ختمِ نبوّت	۱،۷۵	.. ..
۴	دکن کی سیاسی تاریخ	۵،۰۰	۳،۲۵
۵	سلاجقہ	۵،۲۵	۳،۰۰
۶	خطبات (مکمّل)	۱۰،۰۰	.. ..
۷	خطبات حصّہ دوم (اسلام)	۱،۷۵	.. ..
	" " چہارم (زکوٰۃ)	۱،۲۰	.. ..
	" " پنجم (حج)	..،۸۰	.. ..
۸	دینیات (زیرِ طبع)	.. ..	.. ..
۹	توحید رسالت اور زندگی بعد موت کا عقلی ثبوت	۱،۴۵	.. ..
۱۰	تفہیمات حصّہ اوّل	۱۱،۲۵	۶،۵۰
	" " دوم	۱۳،۲۵	۸،۰۰
	" " سوم	۸،۲۵	۶،۰۰
۱۱	سُنّت کی آئینی حیثیت	۹،۵۰	۵،۷۵
۱۲	مسئلہ جبر و قدر	۲،۲۵	۱،۶۰
۱۳	اسلام اور جاہلیت	.. ..	۱،۰۰
۱۴	تجدید و احیائے دین	۴،۵۰	۲،۵۰
۱۵	دینِ حق	۱،۰۰	.. ..
۱۶	بناؤ بگاڑ	..،۸۵	.. ..
۱۷	شہادتِ حق	۱،۰۰	.. ..

نمبر شمار	نام کتاب	اعلیٰ ایڈیشن (روپے پیسے)	سستا ایڈیشن (روپے پیسے)
۱۸	اسلام کا اخلاقی نقطۂ نظر	.. ..	..،۵۵
۱۹	تحریکِ اسلامی کی اخلاقی بنیادیں	۱،۵۰	.. ..
۲۰	اسلامی عبادات پر تحقیقی نظر	۳،۵۰	.. ..
۲۱	الجہاد فی الاسلام	۱۶،۰۰	۱۰،۰۰
۲۲	جہاد فی سبیل اللہ	.. ..	..،۸۵
۲۳	نشری تقریریں	۲،۹۰	.. ..
۲۴	مسئلہ قربانی	..،۸۵	.. ..
۲۵	رسائل و مسائل حصّہ اوّل	۱۰،۰۰	۴،۵۰
	" " " دوم	۱۳،۰۰	۵،۷۵
	" " " سوم	۱۱،۰۰	۴،۵۰
	" " " چہارم	۸،۵۰	۳،۷۵
۲۶	اسلامی نظامِ زندگی اور اس کے بنیادی تصورات	۱۰،۵۰	۵،۰۰
۲۷	دعوتِ اسلامی اور اس کے مطالبات	۵،۷۵	.. ..
۲۸	مسلمانوں کا ماضی حال اور مستقبل	.. ..	..،۹۰
۲۹	ہدایات	.. ..	۱،۰۰
۳۰	تحریکِ اسلامی کا آئندہ لائحہ عمل	.. ..	..،۹۰
۳۱	اسلامی ریاست	۱۹،۵۰	.. ..
۳۲	اسلامی دستور کی تدوین	۲،۰۰	.. ..
۳۳	اسلامی قانون اور پاکستان میں اسکے نفاذ کی عملی تدابیر	۱،۷۵	.. ..
۳۴	خلافت و ملوکیت	۱۰،۰۰	.. ..
۳۵	اسلام کا نظریۂ سیاسی	..،۶۰	.. ..

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد (۸۰) | نومبر ۱۹۷۳ء مطابق شوال ۱۳۹۳ھ ہجری | عدد (۳)

اشارات

مقالات

ماہنامہ ترجمان القرآن

۵-اے ذیلدار پارک - اچھرہ لاہور

زر سالانہ دس روپیہ ـــــــ فی پرچہ ایک روپیہ

ابوالخیر مودودی پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا - پرنٹر: محمد شفیع

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات

جذبۂ فنا کے کئی ایک مدارج اور متعدد صورتیں ہیں۔ ایک صورت تو یہ ہے کہ کوئی شخص کسی اعلیٰ اور ارفع نصب العین کو اپنا کر اس میں اس طرح کھو جائے کہ اسے اپنے وجود تک کی بھی خبر نہ رہے یا کسی پاکیزہ سیرت و کردار رکھنے والے شخص کی سیرت کی پاکیزگی اس کے دل و دماغ کو اس حد تک متاثر کر دے کہ وہ اس میں بالکل جذب ہو کر رہ جائے۔

جذبۂ فنا کی اِن دونوں صورتوں میں جو صورت بھی ہو مگر ان میں ایک چیز قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتی ہے کہ انسان اس جذبے سے تعمیر و ترقی کا کام لیتا ہے۔ نصب العین میں "فنائیت" اس کے اندر بے پناہ قوت، لازوال عزم اور مقصد کے حصول کے لیے غیر معمولی جذبۂ ایثار پیدا کرتی ہے اور پاکیزہ سیرت و کردار رکھنے والی شخصیت کے اندر فنائیت اس کی اپنی سیرت کو پاکیزہ بنا دیتی ہے۔

یہ جذبۂ فنا اگر ایک طرف اپنے اندر خیر کے متعدد پہلو رکھتا ہے تو دوسری طرف اس میں شر کے بھی بے شمار پہلو پائے جاتے ہیں۔ جب نصب العین گھٹیا اور مقاصد ناپاک ہوں تو پھر جو افراد اور قومیں ان میں اپنے آپ کو کھو دیتی ہیں وہ بھی افکار و نظریات اور سیرت کے اعتبار سے انتہائی پست سطح پر اتر آتی ہیں اور نہ صرف اپنے آپ کو برباد کرتی ہیں بلکہ قوموں اور نسلوں کی تباہی کا باعث بنتی ہیں۔ یہی حال بدقماش، فساق و فجار اور حامیانِ ظلم و استبداد کے عشق میں فنا ہونے والوں کا ہوتا ہے۔ ان کا جذبۂ فنا انہیں بربادی کے ان مہیب غاروں میں دھکیل دیتا ہے جن میں ان کے "مثالی انسان" ان سے پیشتر گر کر تباہ ہو چکے ہوتے ہیں۔

اسے قدرت کی ستم ظریفی کہیئے کہ تعمیر و ترقی کے معاملے میں تو کوئی فرد یا قوم اپنے نصب العین سے بڑھ

کہ کبھی کوئی چیز حاصل نہیں کر سکتی بلکہ اپنے سارے اخلاص کے باوجود مکمل نصب العین تو کیا اس کا ایک حصہ بھی بمشکل حاصل کرتی ہے۔ یہی صورتِ حال نیک افراد کی بلند سیرتوں کو اپنانے کے معاملے میں پیش آتی ہے۔ "فنا فی الشیخ" کا جذبۂ صادق رکھنے کے باوجود مسترشد مرشد کے سارے اوصاف کو کما حقہٗ اپنے اندر پیدا کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ مگر اس کے برعکس جب کوئی فرد اور قوم پست مقاصد اور گھٹیا انسانوں کے عشق میں کھو جائے تو وہ پستی اور گھٹیا پن میں ان پستیوں سے کہیں زیادہ نیچے گر جاتی ہے جو آغاز سے اس کے پیشِ نظر ہوتی ہیں۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ انسان سربلند تو مشکل سے ہوتا ہے مگر پستی کی طرف بڑی سرعت سے لڑھک جاتا ہے۔ چنانچہ جن افراد اور قوموں نے کسی ارفع و اعلیٰ نصب العین کو اپنا کر تعمیر و ترقی کی راہ اختیار کی انہیں قدم قدم پر دشواریاں پیش آئیں اور ان کے مقابلے میں جن لوگوں نے تخریب اور تنزل کو اپنی منزل ٹھہرایا انہوں نے بکمال عجلت ملکوں اور قوموں کو برباد کر کے رکھ دیا۔

اسے اس ملک کی بدقسمتی کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے ہاں اعلیٰ مقاصد اور سیرت و کردار کے ارفع نمونوں کو اپنانے کا جذبہ اور رجحان قریب قریب ختم ہوتا جا رہا ہے اور ناپاک مقاصد کی پیروی اور خدا سے غافل انسانوں کے طرزِ فکر اور طرزِ عمل کو اپنانے کا جذبہ بہت تیزی سے بڑھ رہا ہے خصوصاً اس ملک کے برسرِ اقتدار طبقوں کے اندر یہ رجحان تو فنائیت کی حد تک نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جس پستی تک خدا کے نافرمان بندے اپنی ساری بدا عمالیوں کے باوجود صدیوں کی مسافت طے کرنے کے بعد پہنچے ہم اس منزل تک بہت جلد پہنچ گئے ہیں۔ اور اگر ہمارے اشرافی سر یعتگی کا یہی حال رہا تو ہم نہ صرف خدا کے ان نافرمانوں کی ساری برائیاں بڑی تیزی کے ساتھ پوری طرح اپنے اندر جذب کر لیں گے بلکہ فسق و فجور، ناانصافی، ظلم و استبداد، حرصِ دنیا اور بے اصولے پن میں ان سے بھی اس حد تک آگے بڑھ جائیں گے کہ خود انہیں ہمارے کرتوتوں کو دیکھ کر وحشت ہو گی

تہذیبِ مغرب کے عشق میں مبتلا ہمارے ملک کی "موثر اقلیت" نے جو غالباً ہماری شامتِ اعمال کی بنا پر اول روز ہی سے پاکستان کی ہیئت حاکمہ بھی چلی آ رہی ہے، ہمارے معاشرے کو بڑی سرعت کے ساتھ مغربی اقدار کے سانچوں میں ڈھال دیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ پاکستان کو اسلام کی تجربہ گاہ بنانے والی

قوم کے دل و دماغ پر اب لندن، پیرس، ماسکو اور واشنگٹن کے معاشروں کی پیروی کا بھوت سوار ہو گیا ہے۔ اگر آپ مغربی تہذیب کے ساتھ اس کے اس جذبۂ فنا کا بغور مطالعہ کریں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ اس نے مغرب کے ساتھ گہری محبت و عقیدت کے باوجود صرف اس تہذیب کی برائیوں کو ہی اپنے اندر جذب کرنے کی کوشش کی ہے اور اس کی کسی اچھائی کو اپنانا تو کجا اُسے اپنے قریب بھی پھٹکنے نہیں دیا۔ جب رخ پستی کی طرف ہو اور ذہنی میلان بھی پست ہی ہو تو بلندی کی طرف آخر انسان کیونکر بڑھ سکتا ہے۔ مغربی تہذیب بھی دوسری مادی تہذیبوں کی طرح پہلو دار تہذیب ہے۔ اس کے اندر تخریب کے لاتعداد پہلوؤں کے ساتھ کچھ پہلو تعمیر کے بھی ہیں کیونکہ اگر اس میں تعمیر کے یہ پہلو نہ ہوتے تو وہ کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی اپنے آپ کو برقرار نہ رکھ سکتی۔ لیکن ہمارے "اشراف" اُس کے جس پہلو پر فریفتہ ہوئے ہیں وہ اس کی "لذت پرستی" ہے۔ اس کے نتائج ہمارے سامنے ہیں کہ ہماری قوم کی اکثریت ان بلند اور پاکیزہ مقاصد سے جن کی بناء پر ہمیں بارگاہِ ایزدی سے "امتِ وسط" کی خلعت عطا ہوئی تھی ـــــ ناآشنا ہو کر حرص و آز کی غلام بنتی جا رہی ہے۔ جب کسی قوم کے سامنے کوئی اعلیٰ نصب العین موجود نہ رہے اور اس کی جدوجہد کی حدِ کمال چند لذات کا حصول قرار پائے تو اس سے نہ صرف اس کے اخلاق تباہ ہوتے ہیں بلکہ اس کے ضمیر پر بھی موت طاری ہو جاتی ہے۔ مذہب کے ساتھ تعلقِ خاطر کے باوجود اس کی عملی زندگی میں کوئی ایسی چیز نظر نہیں آتی جسے دیکھ کر یہ کہا جا سکے کہ یہ قوم کسی متعین اسلوبِ حیات کی علمبردار ہے اور اس اسلوبِ حیات کی وجہ سے اِس کے افراد حلال و حرام اور پسند و ناپسند کے بارے میں اپنا ایک مخصوص نقطۂ نظر رکھتے ہیں اور اس نقطۂ نظر سے ہٹ کر وہ کبھی کوئی ایسا کام کرنے پر آمادہ نہیں ہو سکتے جس سے اس امتیاز کے مٹ جانے کا خطرہ ہو۔

پاکستانی قوم میں لذت پرستی کے جنون نے مادہ پرستی کی راہ ہموار کی ہے۔ اور اس کے اخلاق کی جڑوں کو بالکل کھوکھلا کر کے رکھ دیا ہے اور اسے اس حد تک بے ضمیر بنا دیا ہے کہ اس کی ایک بہت بڑی اکثریت معمولی سے دنیوی مفادات کی خاطر بڑے سے بڑے دینی اصول اور اخلاقی ضابطے کو نظر انداز کرنے پر تیار ہو جاتی ہے۔ عوام و خواص دونوں ان ذرائع و وسائل کے حصول میں منہمک ہی نہیں بلکہ جذبۂ فنا کی منازل طے کرتے نظر آتے ہیں خواہ اس انہماک و استغراق میں انہیں ایمان جیسی متاعِ گراں مایہ ہی سے ہاتھ کیوں نہ دھونے پڑیں۔ ایک انسان کی زندگی میں اصل اہمیت اس چیز اور اصول کو حاصل ہوتی ہے جسے وہ

سب سے زیادہ محبوب رکھتا ہے اور جس کے سامنے وہ دنیا کی ہر دوسری چیز کو ہیچ سمجھتا ہے۔ مسلم قوم کو جب متاعِ ایمان سب سے زیادہ عزیز تھی تو وہ دنیا کی ہر دوسری متاع کو اس کے لیے قربان کرنے پر آمادہ رہتی تھی اور کبھی اس بات کا تصور بھی نہ کیا جا سکتا تھا کہ وہ کسی بڑے سے بڑے دنیوی نفع کے لیے اسے نظرانداز کر دے گی۔ دنیوی مال و اسباب تو کیا ایمان کے مقابلے میں اس کے افراد جان کو بھی کسی قدر و قیمت کا حامل نہ سمجھتے تھے اور جان دے دینے کے بعد بھی زبانِ حال سے یہی کہتے تھے:

"حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا"۔ مگر آج چونکہ نصب العین کا محور تبدیل ہونے سے فکر و نظر کے زاویے، خوب و ناخوب کے پیمانے اور بھلائی اور برائی کے معیارات اور جدوجہد کے رخ بدل گئے ہیں اس لیے اب حال یہ ہو گیا ہے کہ چھوٹے چھوٹے دنیوی فائدوں کی خاطر بڑی بے تکلفی کے ساتھ ایمان اور ضمیر کے سودے کیے جاتے ہیں۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ ایک معمولی سی اقلیت کو چھوڑ کر اس ملک کی عظیم اکثریت کا ضمیر ایک قابلِ بیع و شریٰ چیز بن کر رہ گیا ہے۔ وہ لوگ جو معاشرے میں کوئی مؤثر قوت نہیں رکھتے انہیں معمولی سا لالچ اور دباؤ اپنے ضمیر کے خلاف فیصلہ کرنے پر آمادہ کر سکتا ہے اور جو معاشرے میں ذرا نمایاں مقام رکھتے ہیں انہیں ان کے حسبِ مرتبہ مناصب یا بعض دوسری مراعات جادۂ مستقیم سے بآسانی ہٹا سکتی ہیں۔ بات اگرچہ بڑی تلخ ہے مگر ہے حقیقت کہ ہمارے ملک کے فرمانرواؤں نے عوام و خواص کو باضمیر انسان بننے کی تربیت دینے کے بجائے ضمیر کو باقاعدہ بیچنے کے ڈھنگ سکھائے ہیں۔ اس کا نتیجہ ہے کہ یہاں سیرچشم، قانع، بااصول، غیرت مند اور باضمیر انسانوں کی تشویشناک حد تک کمی ہو گئی ہے اور ان کی جگہ طالع آزماؤں کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ قوم کی ایک بھاری تعداد ضمیر کو منڈی کا مال سمجھ کر ہمیشہ گاہکوں کی تلاش میں رہتی ہے کہ کب کوئی اس کا سودا چکا کر اسے اپنی تحویل میں لے لے۔ مگر ضمیر کے گاہک بھی غالباً اپنے ضمیر بیچ کر اس شعور اور احساس سے یکسر محروم ہو چکے ہیں کہ جن لوگوں کے ضمیر آج بناسپتی گھی کے چند ڈبوں اور کھانڈ کے چند سبروں یا زیادہ سے زیادہ چند پرمٹوں یا بھتیجوں، بھانجوں اور بیٹوں کو ملازمت دلوانے کے عوض خریدے جا سکتے ہیں کیا وہ یہ ضمیر کل دوسرے گاہکوں کے ہاتھ جہاں سے انہیں بہتر قیمت وصول ہونے کی توقع ہو ـــ بیچنے پر تیار نہ ہوں گے۔ ضمیر کو جب ایک مرتبہ منڈی کا مال بنا دیا جائے تو پھر اس کے فروخت کنندگان اس بات سے بے نیاز ہو جاتے ہیں کہ کون کس وقت اسے خرید رہا ہے انہیں تو اسے بیچنا

ہی ہے جو زیادہ دام ادا کرے وہ اسے بخوشی اس کے ہاتھ بیچ دیتے ہیں۔

ہمارے ملک میں اس وقت جو خوفناک سیاسی بحران پیدا ہوا ہے اس کے اسباب کا اگر کھوج لگایا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کا سب سے اہم سبب قوم کو بے ضمیر بنانے کی شعوری یا غیر شعوری کوشش ہے۔ ایک فرد یا مختصر سے گروہ نے اقتدار پر قبضہ کرنے اور قبضہ کرنے کے بعد اس کے ساتھ چپکے رہنے کے لیے یہ ضروری سمجھا کہ ہر جائز اور ناجائز طریق سے ان تمام افراد اور گروہوں کو خرید لیا جائے جو اس کے لیے کسی وقت بھی وجہ پریشانی بن سکتے ہیں۔ ادھر ان افراد اور گروہوں کی بہت بڑی تعداد نے دنیوی مفادات کے حصول اور پھر ان کے تحفظ کے لیے یہ ضروری سمجھا کہ کسی طرح حکومت کے ایوانوں میں ان کی رسائی کا کوئی سامان پیدا ہو اور اس طرح معاشرے اور انتظامیہ میں انہیں اپنی چودھراہٹ قائم کرنے کے مواقع میسر آسکیں تاکہ وہ اس کی مدد سے زیادہ سے زیادہ دنیوی منافع حاصل کر سکیں اور کسی میں یہ پوچھنے کی ہمت نہ ہو کہ حضور مال و متاع کی صورت میں یہ جو کچھ اکٹھا کیا جا رہا ہے اس کے لیے آپ کے پاس کونسا اخلاقی اور قانونی جواز ہے۔ ضمیر کی اس سودا بازی نے سب سے پہلے مسلم لیگ کو تباہ کیا۔ اس کی تباہی کے بعد بے ضمیر لوگ ریپبلیکن پارٹی کی طرف ٹوٹ پڑے اور اس وقت تک اس کا پیچھا نہ چھوڑا جب تک کہ یہ فنا کے گھاٹ نہ اتر گئی۔ پھر جب فیلڈ مارشل محمد ایوب صاحب نے تخت اقتدار پر براجمان ہونے کے بعد کنونشن لیگ کی تشکیل کی تو نفس کے یہ بندے بڑی عقیدت کے ساتھ جوق در جوق اس میں داخل ہونے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے بظاہر یہ ایک مضبوط پارٹی بن گئی مگر اس کی قوت اور شان و شوکت کا سارا دار و مدار صرف فیلڈ مارشل صاحب کا تخت شاہی پر فائز ہونا تھا۔ جب ان کا سنگھاسن ڈولتا دکھائی دیا اور بھٹو صاحب مستقبل قریب میں حکمران بنتے نظر آئے تو یہی لوگ کنونشن لیگ کو دغا دے کر پیپلز پارٹی میں آشامل ہوئے اور اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے دوسروں کے خلاف سازشیں کرنے لگے اور ایک دوسرے سے بڑھ کر صاحب اختیار کو اس امر کا یقین دلانے لگے کہ ان کا اگر اس ملک میں کوئی ہی پکا خیر اندیش اور بہی خواہ ہے تو یہ ناچیز خادم ہی ہیں۔ باقی سب اُن کے بد اندیش اور دشمن ہیں۔ اس لیے اُن کی نظر کرم کے صرف وہی مستحق ہیں۔ اس قسم کی ذہنی اور اخلاقی فضا میں اہل پاکستان کا جو قومی کردار بن سکتا اسے سمجھنے کے لیے کسی عمیق مطالعہ اور مشاہدے کی ضرورت نہیں۔ ہر وہ شخص جو اس ملک میں زندگی کے دن پورے

کر رہا ہے۔ وہ خود اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ کر بخوبی اندازہ کر سکتا ہے۔

اگر اس ملک کے "اشراف" نے ایک طرف معاشرے کے اندر غلط رجحانات کو جنم دیا ہے تو دوسری طرف اپنے آپ کو بھی ایسے حکمرانوں اور فرمانرواؤں کی اندھی عقیدت میں گرفتار کیا ہے جن کے کارنامے انسانی تاریخ میں سیاہ ابواب کے عنوانات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مسلمانوں میں تو خیر ایک اچھی خاصی تعداد ایسے فرمانرواؤں کی رہی ہے جو اپنی نیکی، پاکبازی، حسنِ اخلاق اور خدا خوفی کی بنا پر فرمانرواؤں سے کہیں زیادہ درویش کہلانے کے مستحق تھے اور جن کی غیر معمولی فائدانہ اور انتظامی صلاحیتوں نے اسلامی قلمرو کو "جنتِ ارضی" بنا دیا تھا، مگر دوسری قوموں میں بھی بعض ایسے حکمرانوں کا پتہ چلتا ہے جن کی وجہ سے انسانیت کو جور و جفا سے چھٹکارا حاصل ہوا اور راسے سکھ اور چین کی زندگی نصیب ہوئی۔ ہمارے ملک کے اصحابِ اقتدار کے دلوں میں ان نیک نفس حکمرانوں میں سے کسی حکمران کی پیروی کا جذبہ کبھی پیدا نہیں ہوتا۔ ان کی نظروں میں ہر پھر کر ہٹلر، مسولینی، لینن اور سٹالن جیسے جابر حکمران ہی بطور آئیڈیل سماتے ہیں اور وہ تختِ اقتدار پر متمکن ہونے کے لیے قریب قریب وہی ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں جو وہ اپنے عہدِ اقتدار میں اختیار کرتے رہے ہیں اور عنانِ اقتدار سنبھالنے کے بعد اُن کے طور طریقوں کو ہی وہ اپنے لیے نمونہ سمجھتے ہیں۔ ان لوگوں کے افکار و نظریات اور ان کی حرکات و سکنات کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ جابر اور ظالم حکمران ان کے روحانی اور سیاسی پیشوا ہیں اور اُن کی محبت اور عقیدت میں یہ درجہ فنا تک پہنچے ہوئے ہیں۔

ان جابر حکمرانوں کی کارگزاریوں کا اگر جائزہ لیا جائے تو بعض رجحانات زمان و مکان اور معاشرتی و سیاسی حالات کے وسیع اختلافات کے باوجود سب میں مشترک نظر آتے ہیں۔ سب سے پہلا رجحان جو دنیا کے سارے آمروں میں بڑی نمایاں حیثیت سے پایا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ قوم کی ذہنی اور اخلاقی تربیت کرنے کے بجائے اُسے سطحی جذباتیت اور کھوکھلے نعروں کا خوگر بنایا جائے تاکہ وہ فہم و تدبر کے ساتھ کوئی قدم نہ اٹھا سکے اور جذباتی اور خوش کن نعروں کے سحر میں ہمیشہ گرفتار رہے اور جو شخص بھی زبان کے استعمال کے معاملے میں مطلق العنان، بلند بانگ دعوے کرنے میں ماہر ہو اور عوام کے جذبات

سے کھیلنے میں مشاق ہو وہ بلاسوچے سمجھے اور حقائق سے یکسر بے پروا ہو کر اُس کے پیچھے چل پڑے، اور جن کے پیچھے وہ اندھی ہو کر چل رہی ہے اُن سے یہ بھی نہ پوچھ سکے کہ حضور! آخر آپ ہمیں کس منزل کی طرف لے جا رہے ہیں؟ اگر قوم کے جذبات میں اشتعال اور ہیجان کے بجائے ٹھہراؤ اور توازن ہو اور وہ ہر چھوٹے بڑے معاملے کا فیصلہ عقل و فکر کی معتدل میزان پر تول کر کرنے کی عادی ہو تو اس قوم میں کبھی فرعون، نمرود، شداد پیدا نہیں ہوتے اور اگر کوئی سرپھرا یہ ناپاک عزم لے کر اٹھے بھی تو جلد ہی اس کی مذموم کوششوں کو ناکام بنا دیا جاتا ہے۔ فرعون اسی قوم میں اپنے رب ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔ جو یا تو غیرت اور احساس سے یکسر محروم ہو چکی ہو یا اس کے جذبات میں اس حد تک تلاطم پیدا ہو چکا ہو کہ اُسے عقل کی بات بتانے والے اور حقائق سے آشنا کرنے والے اپنے دشمن نظر آتے ہوں اور دلفریب نعروں کے بل بوتے پر اُسے بیوقوف بنانے والے، ہمدرد اور خیرخواہ دکھائی دیتے ہوں۔

آمروں کے اندر دوسرا خطرناک رجحان یہ پایا جاتا ہے کہ وہ ہمیشہ اس بات کے لیے کوشاں رہتے ہیں کہ کسی طرح ملک اور قوم کے اندر بے یقینی، افراتفری، یاس، ناامیدی، انتشار اور طوائف الملوکی کی کیفیت پیدا ہو تاکہ عوام سراسیمہ ہو کر خود بخود اُن کے دام میں آجائیں۔ آمر یہ کام اُسی ذہنیت سے کرتے ہیں جس ذہنیت سے کہ مچھلیوں اور پرندوں کے شکاری پہلے تو جال پھیلاتے ہیں اور پھر ان آبی جانوروں اور پرندوں کے اندر سراسیمگی پیدا کر کے انہیں جال کی طرف دھکیلتے ہیں تاکہ وہ بڑی آسانی کے ساتھ زیرِ دام آجائیں۔ افراتفری کی یہ فضا متعدد طریقوں سے پیدا کی جاتی ہے۔ مثلاً ایک معاشرہ جن اقدار پر قائم ہے یا جو روایات اس کے رگ و پے میں سرایت ہو چکی ہیں اُن کے خلاف عوام میں اور خصوصاً نوجوانوں کے اندر شدید جذبۂ نفرت و حقارت پیدا کرنا اور اُنہیں اس امر کا یقین دلانا کہ یہ مروجہ اقدار اور روایات محض اوہام اور بیکار کی زنجیریں ہیں جن کے ذریعے اُن کا استحصال کیا جاتا رہا ہے۔ تاریخ کے اوراق اس حقیقت کے شاہد ہیں کہ جب بھی اخلاقی اور معاشرتی اقدار کے حصار کو مسمار اور روایات کے بندھنوں کو توڑا گیا تو اس کے نتیجے میں ہمیشہ قوم پر آمریت مسلط ہوئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اخلاقی اقدار اور روایات ہی انسانوں کے اندر نظم و ضبط پیدا کرتی ہیں۔ ان کی حیثیت انسانی زندگی میں ایک ایسے داخلی قانون اور ضابطے کی ہی ہوتی ہے جن کی انسان خود پیروی پر آمادہ اور پابندی پر راضی (باقی صفحہ ۷۵ پر)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

پیدائش سے آغاز نبوت تک

(۳)

زید بن حارثہ کا واقعہ سب سے زیادہ جو واقعہ آپؐ کے بلند ترین اخلاق کی شہادت دیتا ہے وہ حضرت زید بن حارثہ کا ہے۔ یہ قبیلۂ کَلب کے ایک شخص حارِثہ بن شُرَحبیل (یا شَراحیل) کے بیٹے تھے اور ان کی ماں سُعدیٰ بنتِ ثَعلَبہ قبیلۂ طے کی شاخ بنی مَعن سے تھیں۔ جب یہ آٹھ سال کے بچے تھے اس وقت ان کی ماں انہیں اپنے نیکے لے کر گئیں۔ وہاں بنی قَین بن جَسر کے لوگوں نے ان کے پڑاؤ پر حملہ کیا اور لوٹ مار کے ساتھ جن آدمیوں کو وہ پکڑ لے گئے ان میں حضرت زیدؓ بھی تھے۔ پھر اُنہوں نے طائف کے قریب عُکاظ کے میلے میں لے جا کر ان کو بیچ دیا۔ خریدنے والے حضرت خدیجہؓ کے بھتیجے حکیم بن حزام تھے۔ انہوں نے مکہ لا کر اپنی پھوپھی صاحبہ کی خدمت میں انہیں نذر کر دیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جب حضرت خدیجہؓ کا نکاح ہوا۔ تو حضورؐ نے ان کے ہاں زیدؓ کو دیکھا اور ان کی عادات و اطوار آپؐ کو اس قدر پسند آئیں کہ آپؐ نے انہیں حضرت خدیجہؓ سے مانگ لیا۔ اس طرح یہ خوش قسمت لڑکا اُس خیر الخلائق ہستی کی خدمت میں پہنچ گیا جسے چند سال بعد اللہ تعالیٰ نبی بنانے والا تھا۔ اس وقت حضرت زید کی عمر ۱۵ سال تھی۔ کچھ مدت بعد ان کے باپ اور چچا کو پتہ چلا کہ ہمارا بچہ مکہ میں ہے۔ وہ انہیں تلاش کرتے ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچے اور عرض کیا کہ آپؐ جو فدیہ چاہیں ہم دینے کے لیے تیار ہیں، آپ ہمارا بچہ ہمیں دے دیں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ میں لڑکے کو بلاتا ہوں اور اسی کی مرضی پر چھوڑے دیتا ہوں کہ وہ تمہارے پاس جانا چاہتا ہے یا میرے پاس رہنا پسند کرتا ہے۔ اگر وہ تمہارے ساتھ جانا چاہے گا تو میں کوئی فدیہ نہ لوں گا اور اسے یوں ہی چھوڑ دوں گا۔ لیکن اگر وہ میرے پاس رہنا چاہے تو میں ایسا آدمی نہیں ہوں کہ جو شخص میرے پاس رہنا چاہتا ہو اسے خواہ مخواہ نکال دوں۔ انہوں نے کہا یہ تو آپ نے انصاف سے بھی بڑھ کر درست بات فرمائی ہے۔ آپؐ بچے کو بلا کر پوچھ

لیجیے۔ حضورؐ نے زیدؓ کو بلایا اور ان سے کہا اِن دونوں صاحبوں کو جانتے ہو؟ انھوں نے عرض کیا "جی ہاں، یہ میرے والد ہیں اور یہ میرے چچا"۔ آپؐ نے فرمایا "اچھا تم ان کو بھی جانتے ہو اور مجھے بھی۔ اب تمھیں پوری آزادی ہے، چاہو تو ان کے ساتھ چلے جاؤ اور چاہو تو میرے ساتھ رہو"۔ انھوں نے جواب دیا "میں آپؐ کو چھوڑ کر کسی کے پاس نہیں جانا چاہتا"۔ ان کے باپ اور چچا نے کہا "زید، کیا تو آزادی پر غلامی کو ترجیح دیتا ہے اور اپنے ماں باپ اور خاندان کو چھوڑ کر غیروں کے پاس رہنا چاہتا ہے؟" انھوں نے جواب دیا کہ "میں نے اس شخص کے جو اوصاف دیکھے ہیں ان کا تجربہ کر لینے کے بعد اب میں دنیا میں کسی کو بھی اِس پر ترجیح نہیں دے سکتا"۔ زیدؓ کا یہ جواب سُن کر ان کے باپ اور چچا بخوشی راضی ہوگئے۔ حضورؐ نے اُسی وقت زیدؓ کو آزاد کر دیا اور حرم میں جا کر قریش کے مجمع عام میں اعلان فرمایا کہ "آپ سب لوگ گواہ رہیں، آج سے زید میرا بیٹا ہے، یہ مجھ سے وراثت پائے گا اور میں اِس سے"۔ اسی بنا پر لوگ ان کو زیدؓ بن محمدؐ کہنے لگے۔ یہ سب واقعات نبوت سے پہلے کے ہیں۔ حضورؐ جب منصب نبوت پر سرفراز ہوئے اُس وقت حضرت زیدؓ کو آپؐ کی خدمت میں رہتے ہوئے ۱۵ سال گزر چکے تھے اور ایمان لانے کے وقت اُن کی عمر ۳۰ سال تھی۔

(تفہیم القرآن، جلد چہارم، الاحزاب، حاشیہ ۶۸)

حضرت علیؓ حضورؐ کی سرپرستی میں اِس زمانہ میں حضورؐ نے اپنے چچا ابوطالب کے اُن احسانات کو بھی یاد رکھا جو بچپن سے جوانی تک انھوں نے آپ پر کیے تھے۔ ابن اسحاق کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ جب مکہ اور اس کے اطراف میں شدید گرانی رونما تھی، آپؐ کو خیال آیا کہ میرے چچا کی مالی حالت کمزور ہے اور وہ کثیر العیال آدمی ہیں۔ ان کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے کچھ کرنا چاہیے۔ چنانچہ آپ اپنے دوسرے چچا حضرت عباسؓ کے پاس گئے جو مالدار آدمی تھے اور ان سے کہا کہ "آپ کے بھائی کا کنبہ بڑا ہے، مالی حالت اچھی نہیں ہے، اور لوگ جس شدید گرانی کی حالت میں مبتلا ہیں وہ آپ دیکھ ہی رہے ہیں۔ چلیے، ہم ان کا بار ہلکا کرنے کے لیے ان سے بات کریں اور ان کے ایک بیٹے کو آپ اپنی کفالت میں لے لیں اور ایک کو میں لیے لیتا ہوں"۔ حضرت عباس اس بات پر راضی ہوگئے اور دونوں چچا بھتیجوں نے ابوطالب کے پاس جا کر مدعا بیان کیا۔ انھوں نے کہا عُقیل اور (بقول ابن ہشام) طالب کو میرے لیے چھوڑ دو، باقی جس کو تم میں سے جو لینا چاہے لے لے۔ اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علیؓ کو اپنے ہاں لے گئے اور حضرت عباسؓ نے حضرت جعفرؓ کو لے لیا۔ حضرت علی ان میں سب سے چھوٹے تھے۔ حضرت جعفر اُن سے دس برس بڑے، حضرت عقیل ان سے دس برس بڑے اور

طالب اُن سے بھی دس برس بڑے تھے۔ ان کے علاوہ ابو طالب کے دوسرے بیٹے بھی تھے۔

اس طرح حضرت علی بچپن ہی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پرورش میں آگئے تھے اور حضورؐ اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے ان کو اپنی اولاد کی طرح پالا تھا۔ اغلب یہ ہے کہ حضرت علیؓ کی عمر اس وقت ۴-۵ برس سے زیادہ نہ تھی۔

کعبہ کی تعمیرِ نو

حضورؐ ۳۵ سال کے تھے اور نبوت میں ابھی پانچ سال باقی تھے کہ قریش نے کعبہ کو از سرِ نو تعمیر کرنے کا ارادہ کیا کیونکہ اس کی عمارت بہت بوسیدہ ہوگئی تھی، دیواریں بھی نیچی تھیں، اور اوپر کوئی چھت بھی نہ تھی۔ کعبہ کا خزانہ اُس وقت ایک کنوئیں میں تھا جو عمارت کے اندر بنا ہوا تھا۔ بعض لوگ دیواریں پھاند کر وہاں پہنچ جاتے اور چوری کر لیتے تھے۔ چنانچہ تعمیر جدید کا فیصلہ ہونے سے پہلے ایک شخص دُوَیک نے کعبہ کا مال چرا لیا تھا، یا چوروں نے مال لے کر دُوَیک کے پاس رکھوا دیا تھا اور اُسی کے پاس سے وہ برآمد ہوا تھا۔ ان وجوہ سے قریش کے لوگ چاہتے تھے کہ بلند اور پختہ عمارت بنا کر اوپر چھت ڈال دیں۔ اسی زمانہ میں ایک رومی تاجر کے جہاز کو سمندر کی موجوں اور طوفانی ہواؤں نے بقولِ ابن اسحاق جُدّہ کے بندرگاہ پر، اور بقول ابن سعد شُعَیبہ پر (جو جُدّہ سے پہلے حجاز کا بندرگاہ تھا) لا کر پٹخ دیا جس سے اس کے ٹکڑے اُڑ گئے۔ اُس میں باقُوم نامی ایک رومی معمار بھی تھا، اور مکہ میں ایک قبطی نجار لکڑی کا کام کرنے کے لیے بھی موجود تھا۔ جہاز ٹوٹنے کی خبر سُن کر وَلید بن مُغیرہ قریش کے چند آدمیوں کے ساتھ وہاں پہنچا اور جہاز کی لکڑیاں خرید لیں۔ باقوم سے بات چیت کر کے ان لوگوں نے اس کو بھی راضی کر لیا کہ تعمیر کعبہ کا کام وہ انجام دے۔ اس کے بعد بنی مخزوم میں سے ایک شخص ابو وَہب بن عَمرو بن عائذ (جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے والد کا ماموں تھا) اٹھا اور اس نے کعبہ کا ایک پتھر نکال کر اس کی جگہ واپس رکھا اور پھر قریش کے لوگوں کو خطاب کر کے کہا ”اے قریش کے لوگو، اس کی تعمیر میں اپنی حلال کی کمائی لگاؤ۔ اِس میں زنا کاری کی کمائی، سود کی کمائی، یا کسی شخص پر ظلم کر کے حاصل کی ہوئی کمائی داخل نہ ہونے پائے“۔ ایک اور روایت میں اس کے الفاظ یہ ہیں کہ ”اس گھر کی تعمیر میں کوئی ایسا مال نہ لگاؤ جو تم نے غصب کر کے، یا قطع رحمی کر کے، یا کسی ذمہ کو جو تمہارے اور کسی دوسرے انسان کے درمیان ہو توڑ کر حاصل کیا ہو“[۵۱]۔ لیکن قریش کے لوگ کعبہ کو منہدم

---

[۵۱] یہ ابن اسحاق کا بیان ہے۔ موسیٰ بن عُقبہ نے مَغازی میں اِسے ولید بن مُغیرہ کا قول لکھا ہے۔

کرتے ہوئے ڈر رہے تھے۔ آخرکار ولید بن مُغیرہ نے سابق عمارت کو ڈھانے کے لیے کدال ہاتھ میں لی اور کہا "اے اللہ، ہم دین سے منحرف نہیں ہوئے ہیں۔ ہم خیر کے سوا اور کچھ نہیں چاہتے"، یعنی کسی بری نیت سے تیرے گھر کو نہیں ڈھا رہے ہیں۔ یہ کہہ کر اس نے کعبہ کے ایک حصہ پر ضرب لگائی اور پھر رک گیا۔ رات بھر سب لوگ اس انتظار میں رہے کہ ولید پر کوئی آفت آتی ہے یا نہیں۔ اگر آفت آجائے تو ہم کام روک دیں گے اور جو پتھرا کھڑا ہے اسے اسی کی جگہ پر لگا دیں گے۔ اور اگر کوئی آفت نہ آئے تو کام جاری رکھیں گے۔ صبح جب ولید پر اس فعل کا کوئی وبال نہ پڑا تو عمارت کو منہدم کرنے کا کام مختلف سمتوں سے مختلف قبیلوں نے اپنے ذمہ لیا اور بنائے ابراہیمی کی بنیاد تک دیواریں توڑ دی گئیں۔ پھر سارے قبیلوں کے لوگ پتھر اٹھا اٹھا کر لانے اور عمارت تعمیر کرنے میں شریک ہوئے۔ جب اُس مقام تک پہنچ گئے جہاں حجر اسود نصب کیا جانا تھا تو ہر قبیلہ چاہتا تھا کہ یہ شرف اسے حاصل ہو۔ اس پر اتنا جھگڑا ہوا کہ آپس میں لڑائی تک کا خطرہ پیدا ہوگیا۔ چار پانچ روز یہی جھگڑا چلتا رہا۔ آخر ایک روز حرم میں سب مشورہ کے لیے جمع ہوئے۔ بنی مخزوم میں سے ایک شخص ابواُمیّہ بن المُغیرہ نے، جو اُس وقت قریش میں سب سے زیادہ سن رسیدہ تھا، اٹھ کر تجویز پیش کی کہ "اے قریش کے لوگو، اپنے اس اختلاف کا فیصلہ کرنے کے لیے اِس بات پر اتفاق کرلو کہ سب سے پہلے جو شخص اِس مسجد کے دروازے[1] سے داخل ہو وہ اس کا فیصلہ کر دے"۔ اس تجویز کو سب نے مان لیا۔ اب خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ سب سے پہلے داخل ہونے والے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ لوگوں نے آپ کو دیکھتے ہی کہا ھٰذا الامینُ، رَضِینا، ھٰذا محمد "یہ امین ہیں، ہم راضی ہوگئے۔ یہ تو محمدؐ ہیں"۔ مسند احمد کی روایت میں ہے کہ لوگوں نے آپ کو دیکھتے ہی کہا اَتاکم الامین "تمھارے پاس امین آگیا"۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب معلوم ہوا کہ اب اس قضیہ کا فیصلہ آپ کو کرنا ہے تو آپ نے فرمایا ایک کپڑا لاؤ۔ لوگ کپڑا لے آئے۔ آپ نے حجر اسود کو اس کپڑے پر رکھ دیا۔ پھر فرمایا ہر قبیلہ ایک ایک طرف سے اس کپڑے کو پکڑے اور سب مل کر حجر اسود کو اٹھائیں۔ جب پتھر اس مقام تک پہنچ گیا جہاں اس کو لگانا تھا تو آپ نے اسے اپنے ہاتھ سے وہاں لگا دیا۔

---

[1] دروازے سے مراد بابِ بنی شَیبہ ہے۔ ایک روایت میں اس کا قول یہ ہے کہ جو شخص سب سے پہلے بابُ الصّفا سے داخل ہو وہ اس کا فیصلہ کرے۔

یہ نبوت سے صرف پانچ سال پہلے کا واقعہ ہے۔ اُس وقت ساری قوم نے بالاتفاق حضورؐ کے امین ہونے کی شہادت دی تھی۔ اور ساری قوم نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ آپ کس قدر دانشمند انسان ہیں کہ اِتنے خطرناک قضیے کو بہترین طریقے سے حل کر کے آپ نے اپنی قوم کو خانہ جنگی سے بچا لیا۔ ابن سعد کا بیان ہے کہ صرف یہی ایک موقع نہ تھا جبکہ حضورؐ نے قریش کے ایک قضیے کا فیصلہ کیا ہو بلکہ نبوت سے قبل اکثر لوگ اپنے معاملات کا تصفیہ کرانے کے لیے آپ سے رجوع کرتے تھے۔

نبوت سے پہلے حضورؐ کو قریب سے جاننے والے

نبوت سے قبل جن لوگوں کو سب سے زیادہ قریب سے آپ کی زندگی دیکھنے اور آپ کے حالات جاننے کا موقع ملا تھا اُن میں کچھ تو آپ کے اپنے گھر کے لوگ تھے، یعنی حضرت خدیجہؓ جو ۱۵ سال سے آپ کی زوجۂ محترمہ تھیں، حضرت علی جنھوں نے بچپن سے آپ کے گھر میں پرورش پائی تھی، حضرت زید بن حارثہ جنھوں نے ماں باپ کو چھوڑ کر آپ کے ساتھ رہنا قبول کیا تھا اور آپ نے ان کو بیٹا بنا لیا تھا، اور حضرت امّ ایمن، جنھوں نے بچپن سے آپ کو پالا تھا اور گھر کے ایک فرد کی حیثیت سے ہمیشہ آپ کے ساتھ رہی تھیں، جنھیں حضورؐ فرمایا کرتے تھے کہ "میری ماں کے بعد یہ میری ماں ہیں"، اور جن کو آپ یا اُمّہ (اے میری ماں)، کہہ کر خطاب فرماتے تھے۔ اِن کے علاوہ گھر سے باہر کے متعدد اصحاب ایسے تھے جنھیں آپ کی ہم نشینی کا شرف حاصل تھا اور جو ایک مدت سے آپ کی صحبت میں بیٹھا کرتے تھے۔

ان میں سب سے زیادہ آپ کے قریبی دوست حضرت ابوبکر تھے۔ جاہلیت کے زمانہ میں بڑے ذی وجاہت اور رؤسائے قوم میں سے ایک رئیس تھے۔ تجارت ان کا پیشہ تھا۔ اپنے اخلاق کی وجہ سے لوگوں میں بہت مقبول تھے۔ وہ اُن لوگوں میں سے تھے جنھوں نے جاہلیت میں بھی کبھی شراب کو ہاتھ نہ لگایا تھا۔ قریش نے دِیَت کے معاملات ان کے سپرد کر رکھے تھے، جس دِیَت کا بار وہ قبول کر لیتے، سارا قبیلہ اسے اٹھانے پر راضی ہو جاتا اور جس بار کو کوئی دوسرا قبول کرتا تو لوگ اس کی توثیق سے انکار کر دیتے تھے۔ انساب کے معاملہ میں بھی قریش کے لوگ سب سے زیادہ ان کے علم پر اعتماد کرتے تھے۔ ان کا جو اخلاقی اثر نہ صرف قریش میں، بلکہ آس پاس کے قبائل تک میں تھا اس کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ جب مکہ میں مسلمانوں پر مظالم کی انتہا ہو گئی تو حضرت ابوبکرؓ بھی ہجرت کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ ایک دن یا دو دن کی مسافت طے کی تھی کہ اَحابیش[۵] کا سردار ابن الدُّغُنَّہ راستے میں ملا۔ اس نے پوچھا ابوبکرؓ، تم کہاں جا رہے ہو؟

[۵] احابیش تین قبیلوں کا مجموعہ تھا جن میں بنو الحارث بن عبد مَناۃ بن کنانہ، (باقی بر صفحہ آئندہ)

انہوں نے کہا "میری قوم نے مجھے نکال دیا ہے، سخت اذیتیں دی ہیں اور میری زندگی تنگ کر دی ہے"۔ اس نے کہا "کیوں؟ خدا کی قسم تم تو معاشرہ کی زینت ہو، مصیبتوں میں لوگوں کے کام آتے ہو، نیک کام کرتے ہو، غریبوں کی مدد کرتے ہو۔ چلو، میں تم کو پناہ دیتا ہوں"۔ پھر وہ انہیں لے کر مکہ میں آیا اور اس نے اعلان کیا کہ "میں نے ابن ابی قحافہ کو اپنی پناہ دی ہے۔ اب کوئی ان سے بھلائی کے سوا کسی اور طرح تعرض نہ کرے"۔

دوسرے صاحب حضرت صُہیب بن سِنانِ رومی تھے۔ اصل میں بنی نَمِر بن قاسِط میں سے تھے جن کا علاقہ ایران کی حکومت میں موصل کے قریب واقع تھا۔ بچپن میں روم و ایران کی ایک لڑائی کے موقع پر گرفتار ہوئے اور ایک مدت تک رومیوں کی غلامی میں رہنے کے بعد فروخت ہوتے ہوتے مکہ پہنچے جہاں عبداللہ بن جُدعان نے ان کو خرید لیا۔ ابن جُدعان چونکہ حضرت ابوبکر کا قریبی رشتہ دار تھا اس لیے ان کے توسط سے یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے متعارف ہوئے اور آپؐ سے مانوس ہو کر اکثر آپؐ کی صحبت میں بیٹھنے لگے۔ ان کا مرتبہ یہ تھا کہ جب حضرت عمر کی وفات ہونے لگی تو انہوں نے وصیت کی کہ جب تک شوریٰ کسی ایک خلیفہ پر متفق نہ ہو جائے یہی مسجد نبوی میں نماز پڑھاتے رہیں۔

تیسرے حضرت عمّار بن یاسر تھے جن کا اپنا قول بَیْہقی نے نقل کیا ہے کہ حضرت خدیجہؓ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شادی کا حال مجھ سے زیادہ اور کون جانتا ہے۔ میں آپ کا ہم نشین، دوست، اور آپ سے بہت مالوف تھا۔ حضرت صُہیب اور یہ ایک ساتھ ایمان لائے۔

چوتھے ضِمَاد الاَزدی، اَزدِ شَنُوءَ ہ میں سے تھے جو زمانۂ جاہلیت میں حضوؐر کے دوست تھے۔

پھر کچھ لوگ وہ تھے جو قریبی رشتہ داری کی وجہ سے آپؐ کو خوب جانتے تھے اور جن سے آپؐ کی زندگی کا کوئی پہلو چھپا ہوا نہ تھا۔ مثلاً حضرت عثمانؓ بن عفان، جو آپ کی پھوپھی ام حکیم البَیضاء کے نواسے تھے۔ حضرت زُبیرؓ بن العوّام، جو آپ کی پھوپھی حضرت صَفیہؓ کے بیٹے تھے۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) بنی الہُون بن خُزیمہ بن مُدرِکہ، اور خُزاعہ میں سے بنو المُصْطَلِق شامل تھے۔ انہوں نے مل کر مکہ کے زیریں علاقہ میں اُحُبْش نامی ایک وادی کے اندر باہم دوستی اور امداد باہمی کا معاہدہ کیا تھا، اس وجہ سے یہ اَحابِیش کہلاتے تھے۔

اور حضرت سعدؓ بن ابی وقاص اور حضرت عُمیرؓ بن ابی وقاص جو حضورؐ کی والدہ ماجدہ کے رشتہ دار تھے۔ حضرت ابوسلمہ جو آپؐ کے پھوپھی زاد بھائی بھی تھے اور دودھ شریک بھائی بھی۔ حضرت عبداللہؓ بن جحش جو آپؐ کی پھوپھی اُمیمہ کے بیٹے تھے۔ حضرت جعفرؓ بن ابی طالب جو آپ کے چچازاد بھائی تھے۔

یہ لوگ سب سے پہلے اسلام لانے والوں میں سے ہیں اور ان کا اسلام لانا یہ معنی رکھتا ہے کہ حضورؐ کی زندگی کو قریب سے دیکھ کر ان کے دلوں پر آپؐ کے فضائلِ اخلاق کا نقش پہلے ہی اس طرح ثبت ہو چکا تھا کہ انہیں آپؐ کو اللہ کا رسول تسلیم کر لینے میں کوئی تأمل نہ ہوا۔ اس ایمان کو رشتہ داری یا دوستی یا ذاتی محبت پر محمول نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ اِن چیزوں کی بنا پر کوئی شخص کسی کی خاطر اپنا دین تبدیل نہیں کیا کرتا۔

حلیۂ شریف

زمانۂ قبل نبوت کے حالات کو ختم کرنے سے پہلے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کا حُلیۂ شریف بھی بیان کر دیا جائے، کیونکہ آدمی کی شخصیت سے اس کے حلیے کا بھی گہرا تعلق ہوتا ہے۔ بخاری، مسلم، مُسند احمد، ترمذی، نسائی، بیہقی، حاکم، دارقطنی وغیرہ کتبِ حدیث میں حضرت علیؓ، حضرت ابوہریرہؓ، حضرت انسؓ، حضرت براءؓ بن عازبؓ، حضرت جابرؓ بن سمرہ، حضرت ابنِ عمرؓ، حضرت عبداللہؓ بن بُسر، حضرت ہندؓ بن ابی ہالہ اور بعض دوسرے صحابۂ کرام سے اس سلسلہ میں جو روایات آئی ہیں، ان کو جمع کر کے ہم مجموعی طور پر آپؐ کا حلیۂ مبارک یہاں بیان کرتے ہیں۔

آپؐ کا قد نہ بہت لمبا تھا نہ ٹھگنا، بلکہ متوسط قامت سے کچھ نکلتا ہوا تھا، اور کسی مجمع میں آپؐ ہوتے تو نمایاں نظر آتے تھے۔ چہرہ نہ لمبوترا تھا نہ بالکل گول، بلکہ کچھ گولائی لیے ہوئے تھا۔ رنگ نہ گندمی تھا نہ سرخ، نہ بالکل سفید، بلکہ گورا سرخی مائل اور روشن تھا۔ سر بڑا تھا۔ سینہ چوڑا تھا اور دونوں شانوں کے درمیان کافی فاصلہ تھا۔ جسم گٹھا ہوا تھا مگر موٹا نہ تھا۔ جوڑ بند بہت مضبوط تھے۔ بازو بھرے ہوئے اور پنڈلیاں جسم سے متناسب تھیں۔ بازوؤں اور پنڈلیوں پر ہلکے ہلکے بال تھے، باقی جسم بالوں سے صاف تھا اور سینے پر بالوں کی ایک لکیر سی ناف تک جاتی تھی۔ سر اور ڈاڑھی کے بال گھنے تھے۔ بالوں میں نہ حبشیوں کی طرح گھونگر یالا پن تھا، نہ بالکل سیدھے تھے، بلکہ ہلکا سا گھونگر تھا۔ آخر عمر تک سر اور ڈاڑھی میں مشکل سے ۲۰ بال سفید ہوئے تھے اور وہ بھی اس وقت نمایاں ہوتے تھے جب آپ نے تیل نہ لگایا ہوتا تھا۔ سر کے بال کبھی نصف کان تک، کبھی کان کی لَو تک اور کبھی اس سے بھی نیچے

تک لمبے رکھتے تھے۔ آنکھیں بڑی بڑی اور بہت خوبصورت تھیں، سرمہ لگائے بغیر بھی ایسا محسوس ہوتا تھا کہ سرمہ لگائے ہوئے ہیں۔ آنکھوں کے ڈھیلوں میں ہلکے ہلکے سرخ ڈورے سے تھے۔ پلکیں گھنی اور لمبی تھیں۔ بھویں ایک دوسری سے الگ تھیں، ملی ہوئی نہ تھیں۔ منہ کشادہ تھا۔ عربوں میں اسی کو خوبصورتی سمجھا جاتا تھا اور چھوٹے منہ کو پسند نہ کیا جاتا تھا۔ ایڑیاں ہلکی تھیں اور ہاتھ پاؤں کی انگلیاں لمبی اور بھاری تھیں۔ پاؤں کی بیچ کی انگلی انگوٹھے سے کچھ نکلتی ہوئی تھی۔ ہتھیلیاں اور تلوے بھرے بھرے تھے۔ پہلی نظر میں جو دیکھتا مرعوب ہو جاتا تھا، مگر جس قدر آپ سے قریب ہوتا اتنا ہی آپ کی نرم مزاجی اور حسنِ اخلاق سے متاثر ہو کر آپ سے مالوف ہوتا جاتا تھا۔ چلتے تھے تو قدم جما کر اس طرح چلتے تھے جیسے گہرائی میں اتر رہے ہوں یا چڑھائی پر چڑھ رہے ہوں۔ کسی طرف ملتفت ہوتے تو پوری طرح ہوتے اور کسی طرف سے رخ پھیرتے تو پوری طرح پھیرتے تھے، دُزدیدہ نگاہوں سے دیکھنے یا صرف گردن موڑ کر دیکھنے کی عادت نہ تھی۔ چہرے پر تبسم طاری رہتا۔ کبھی ہنستے تو ٹھٹھا مار کر نہ ہنستے تھے۔ جسمانی طاقت کا یہ حال تھا کہ ایک دفعہ رُکانہ نے جو قریش کا سب سے زیادہ طاقت ور پہلوان سمجھا جاتا تھا آپؐ سے کشتی لڑی اور آپؐ نے اسے پچھاڑ کر بے بس کر دیا۔ وہ پھر اٹھ کر مقابلہ پر آیا۔ آپؐ نے پھر اسے پچھاڑ دیا۔ اس نے کہا "اے محمدؐ، تعجب ہے، تم مجھے پچھاڑ دیتے ہو" اُس کا مطلب یہ تھا کہ آپؐ نے نہ کبھی ورزشیں کیں نہ پہلوانی کی، پھر بھی آپؐ نے اسے دو دفعہ پچھاڑ کر حیران کر دیا (بعد میں یہ صاحب بھی مسلمان ہو گئے، رضی اللہ عنہ)۔ حضورؐ کے لڑکپن کا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ عبداللہ بن جُدعان کے ہاں ایک دعوت کے موقع پر ابوجہل آپؐ سے اُلجھ پڑا۔ وہ بھی تقریباً آپؐ کے برابر ہی کا لڑکا تھا۔ آپؐ نے اٹھا کر اسے اس طرح پٹخا کہ اس کا گھٹنا زخمی ہو گیا اور اس زخم کا اثر عمر بھر اس کے گھٹنے پر باقی رہا۔ ابن ہشام نے لکھا ہے کہ جنگ بدر میں جب ابوجہل مارا گیا تو حضورؐ نے فرمایا اس کی لاش مقتولوں میں تلاش کی جائے اور اس کے گھٹنے کو دیکھا جائے، اس پر ایک زخم کا نشان ہوگا۔ چنانچہ جب اس کی لاش ملی تو نشان وہاں موجود تھا۔ پھر آپ نے خود یہ قصہ بیان فرمایا کہ اسے یہ زخم کیسے لگا تھا۔

اِس تفصیل سے معلوم ہو جاتا ہے کہ حضورؐ صرف حسن اخلاق ہی کا مجسمہ نہ تھے بلکہ مردانہ حسن اور جوانمردی کا بھی بہترین نمونہ تھے۔ (اضافہ از مؤلف)

لیبیا میں سرقہ اور حرابہ کی حُدود کا قانون

(۲)

(از جناب حبیب ریحان ندوی، لکچرار اسلامک انسٹی ٹیوٹ۔ البیضاء۔ لیبیا۔)

باب سوم

مشترک احکام (درباب سرقہ و حرابہ)

دفعہ ۸۔ اُس مجرم کی سزا جس کی عمر اٹھارہ سال سے کم ہو[1]

وہ استثناء جو دفعہ نمبرا دس میں وارد ہے، جس کی رو سے مجرم پر دونوں جرموں میں اگر اٹھارہ سال

---

[1] سرقہ اور حرابہ دونوں حدود میں مقنن نے حد نافذ ہونے کی عمر کامل اٹھارہ سال ہجری رکھی ہے۔ ان دونوں موقعوں پر راقم نے حاشیہ نہیں لگایا تھا کیونکہ اِس جگہ یہ مناسب ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمان تکالیف شرعیہ کا مکلّف بالغ ہونے کے بعد ہوتا ہے، یعنی اوامرِ الٰہیہ کی اتباع پر ثواب، نواہی کے ارتکاب پر گناہ، اسی طرح حدود و قصاص وغیرہ جیسی قانونی چارہ جوئیاں بھی اُسی وقت ہوتی ہیں۔ لیکن بلوغ سے قبل بھی تعزیر و تادیب کا حکم اس لیے دیا گیا ہے کہ اس طرح بچپن ہی سے شعور اور لاشعور دونوں میں احکام شریعت کی اتباع کا جذبہ اور دین پر عمل پیرا ہونے کی عادت پیدا ہو جائے۔ نماز جوان ہونے کے بعد فرض ہے لیکن سات برس کی عمر میں اس کا حکم دینا اور دس سال کی عمر میں تنبیہ و تادیب کرنا اسی لیے ضروری ہے کہ نماز اس کی عادت ثانیہ بن جائے۔ اسی طرح بلوغ سے پہلے کیے گئے جرم، جیسے چوری، ڈاکہ اور قتل وغیرہ پر حدود و قصاص تو نافذ نہیں ہوں گے کیونکہ شرعی و عقلی طور پر مجرم ابھی مکلّف نہیں ہوا ہے لیکن اس کی تادیب و تنبیہ و تعزیر از حد ضروری ہے کیونکہ مکلّف ہو جانے کے بعد خدانخواستہ یہ جرائم اس کی فطرت و عادت نہ بن جائیں۔

ہجری سے کم عمر ہے تو اس پر حد نافذ نہیں ہوگی اور اس کی تعزیر حسب ذیل طریقوں سے ہوگی۔

ف ۵ اس میں کسی کا اختلاف نہیں کہ تکالیف شرعیہ بالغ ہونے کے بعد شروع ہوتی ہیں اور بلوغ کی اصلی علامت مرد کے لیے انزال و احتلام اور عورت کے لیے حیض ہے۔ لیکن یہ چیزیں ایسی ہیں کہ ایک طرف تو ان کا علم دوسروں کو ممکن نہیں، مجرم ان سے انکار کر سکتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ جس کے بلوغ کا علم نہ ہو یا مقررہ متعدد فقہی علامتوں میں سے کوئی اس میں نہ پائی جائے تو کیا وہ کسی عمر میں بھی تکالیف شرعیہ کا مکلف نہ ہوگا؟ اس سلسلے میں علماء کے بہت سے اقوال ہیں۔ یہاں اختصار کے ساتھ اتنا لکھنا چاہتا ہوں کہ ایسی صورت میں امام ابو یوسف و محمد، امام شافعی و احمد وغیرہ نے مرد و عورت دونوں کے لیے مکمل پندرہ سال کی عمر رکھی ہے۔ ایک روایت میں امام ابو حنیفہ کا بھی یہی قول نقل ہوا ہے۔ مفسر قرطبی مالکی نے امام مالک اور امام ابو حنیفہ کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ سترہ سال کی عمر ہے۔ اس سلسلے میں جو حنفی مراجع راقم نے دیکھے ان میں مجھے یہ قول نہیں ملا۔ لیکن میں نے استقصاء نہیں کیا ہے اس لیے نفی کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ ہاں امام اعظم کا قول ایسی لڑکی کے سلسلے میں جس کے بلوغ کی دوسری علامتیں ظاہر نہ ہوئی ہوں سترہ سال ہے۔ لیکن لڑکے کے سلسلے میں یہ قول راقم کی نظر سے نہیں گزرا۔ قرطبی نے امام مالک کا سترہ سال والا قول اور یہ قول کہ جب اس کی آواز بھاری ہو جائے نقل کیا ہے اور اٹھارہ سال والے قول کی طرف اشارہ نہیں کیا۔ لیکن امام ابو حنیفہ کے دو قول اور نقل کیے ہیں۔ ایک انیس سال اور اسے مشہور بتایا ہے، دوسرا اٹھارہ سال۔ فقہ حنفی کے عظیم مرجع شمس الائمہ ابو بکر السرخسی نے بھی لڑکے کے سلسلے میں دو قول نقل کیے ہیں اور انیس سال والی روایت کو اصح لکھا ہے۔ لیکن حنفی فقہ کے دوسرے مراجع اور ابحاث کی رو سے امام صاحب کا مشہور قول اٹھارہ سال ہی ہے۔ اس کی تاویل بعض حضرات نے یہ کی کہ انیسواں سال شروع ہو جائے۔ لیکن فی الحقیقت یہ تاویل صحیح نہیں، بلکہ یہ دو مختلف روایتیں امام صاحب سے منقول ہیں، کیونکہ بعض روایتوں میں یہ لفظ بھی موجود ہے کہ تا آنکہ انیس سال پورے ہو جائیں۔ قرطبی نے امام مالک کا اٹھارہ سال والا قول نقل نہیں کیا لیکن فقہ مالکی میں بھی یہی قول مشہور و معتبر ہے۔ بلغۃ السالک لاقرب المسالک الی مذہب الامام مالک میں بلوغ کی پانچ علامتیں باب الحجر کے آخر میں بیان ہوئی ہیں۔ ان میں ایک یہ بھی ہے "عمر کا اٹھارہ سال ہونا"۔ مزید اس موضوع کی تفصیل اقوال اور دلائل ان شاء اللہ تفصیلی مضمون میں بیان ہوں گے۔ لیبی مقنن نے امام مالک و امام ابو حنیفہ کے مشہور قول کے مطابق اور احتیاط کی خاطر اٹھارہ سال مقرر کیے ہیں۔ اور تکلیفِ قانونی کی عمر اکثر قوانین جدیدہ میں بھی یہی رکھی جاتی ہے، لیکن اس فرق کے ساتھ کہ اسلامی شریعت قمری سال سے حساب لگاتی ہے اور وضعی قوانین شمسی سال سے۔

---

(۱) اگر اس نے سات سال پورے کر لیے ہیں لیکن پندرہ سال مکمل نہیں ہوئے ہیں تو اس کی تعزیر اصلاحی تدابیر، نصیحت اور سخت کلامی کے ذریعہ کی جائے گی، اور اگر وہ دس سال سے زیادہ ہے تو اس کی تعزیر ضرب سے بھی کی جا سکتی ہے۔

(۲) اگر اس نے پندرہ سال پورے کر لیے ہیں تو سرقہ کے جرم میں اس کی تعزیر ضرب (مار پیٹ) کے ذریعہ ہو گی اور حرابہ کے جرم میں اس کی تعزیر ضرب سے بھی ہو سکتی ہے، اور قانونی اصلاحیہ (تربیت و اصلاح کے لیے بنائی گئی سرکاری تربیت گاہ یا جیل) میں رکھ کر بھی کی جا سکتی ہے۔

(۳) جو دو صورتیں مذکورہ بالا دو بندوں میں پیش کی گئی ہیں ان سے متعلق اگر (اٹھارہ سال سے کم عمر والے مجرم سے) جرم دوبارہ صادر ہو تو مجرم پر ایسی ضرب کا حکم لگایا جائے گا جو اس کی عمر کے مناسب ہو، اور اگر وہ دس سال سے اوپر ہے تو اس کو اصلاحی جیل میں رکھے جانے کا فیصلہ کیا جائے گا۔

(۴) اور دونوں منصوص حدیں (سرقہ و حرابہ) تکرار کی صورت میں اس قانون میں ایک ہی حکم رکھتی ہیں۔

(۵) اس دفعہ میں جو تعزیرات (سزائیں) بیان کی گئی ہیں وہ محض تادیبی کاروائیاں ہیں۔

دفعہ ۹۔ سرقہ اور حرابہ کے جرم کی نوعیت

سرقہ اور حرابہ کے دونوں جرم جن پر حد نافذ ہو گی وہ اس قانون کے احکام کے مطابق ثابت ہوں گے۔

دفعہ ۱۰۔ ثبوت

(۱) اس قانون کی دفعہ نمبر ۱ و ۴ میں بیان کیے ہوئے دونوں جرم عدالت کے سامنے ایک دفعہ اعتراف سے ثابت ہو جائیں گے، یا دو مردوں کی گواہی سے، لیکن مجنی علیہ (جس پر زیادتی کی گئی ہو) کا شمار گواہوں میں نہیں کیا جائے گا۔ حرابہ میں وہ گواہ ہو سکتا ہے بشرطیکہ دوسرے کے حق میں گواہ ہو۔

(۲) مجرم اپنے اعتراف سے انکار کر سکتا ہے آخری فیصلے کے صادر ہونے سے قبل۔ اس صورت میں حد ساقط ہو جائے گی اگر اس کا ثبوت صرف مجرم کے اقرار سے ہوا ہے، اور حد کے ساقط ہونے سے وہ تعزیرات ساقط نہ ہوں گی جو اس دفعہ کے بند نمبر ۳ میں آگے آ رہی ہیں۔

(۳) اور اُن قانونی تعزیرات (سزاؤں) کا اطلاق ہو گا جو عقوبات کے قانون میں درج ہیں، ایسے شخص کے لیے جس کے بارے میں اس دفعہ میں بیان کی گئی شرعی دلیل ثابت نہ ہو، یا اس مجرم کے حق میں

جس نے اپنے اعتراف سے انکار کیا ہو، اور یہ اس صورت میں جبکہ جج جرم کے ثبوت پر کسی بھی دوسری دلیل یا قرینے سے مطمئن ہو۔

دفعہ ۱۱۔ ابتداءِ جرم کی ابتدا اور اس کو شروع کرنے کی سزا، یعنی جرم مکمل نہ ہونے کی صورت میں)

(۱) (لیبی) قانون تعزیرات کے احکام اُس جرم کے شروع کرنے کے بارے میں نافذ العمل ہوں گے جن کے لیے حد مقرر ہے۔

(۲) ابتدا کرنے کی سزا دونوں جرموں میں اس قانون کے مطابق طے کی جائے گی جو قانون تعزیرات (لیبیا) کی دفعہ نمبر ۶۰ و ۶۱ میں وارد ہے اور یہ اس طرح کہ اس جرم پر جو سزا قانون مذکور میں مقرر ہے وہی نافذ ہو گی۔[۵۰]

دفعہ ۱۲۔ جرائم اور سزائیں متعدد ہونے کی صورت میں

(۱) اگر مجرم کے جرم ایک دوسرے سے مربوط ہوں یا کئی ہوں ایسے جن پر حد نافذ ہوتی ہو تو اس طرح سزا دی جائے گی:

(الف) اگر سزائیں ایک ہی جنس کی ہیں اور مقدار میں بھی برابر ہیں تو ایک ہی سزا دی جائے گی۔

(ب)۔ اگر سزائیں تو یکساں نوعیت کی ہیں لیکن مقدار میں تفاوت ہے تو ان میں سے سخت ترین سزا دی جائے گی۔

(ج)۔ اگر سزائیں مختلف الجنس ہیں تو سب کی سب دی جائیں گی۔

(۲) اگر مجرم کی طرف منسوب جرموں میں بعض ایسے دوسرے جرائم بھی ہیں جن کی سزا قانون تعزیرات (لیبیا) میں یا کسی اور قانون کے ماتحت موجود ہے تو سزائیں سابقہ بند کے ماتحت نافذ ہوں گی، لیکن دوسرے جرائم پر دی گئی سزائیں بھی معاف نہیں ہوں گی۔

(۳) قتل کی سزا (موت کی سزا) چاہے وہ حد کی وجہ سے ہو یا قصاص کی صورت میں یا تعزیر کی شکل میں

---

[۵۰] یعنی حد اس وقت نافذ ہو گی جب اس کے نفاذ کی تمام شرطیں پوری ہوں۔ لیکن شروع کرنے اور جرم مکمل نہ ہونے کی صورت میں شرعاً حد نافذ نہ ہو گی۔ کیوں ؟ اس کی نقلی تفصیل، تفصیلی مضمون میں "حرز" سے متعلق بحث میں کروں گا۔ ایسی صورت میں مجرم کو بالکل معاف نہیں کیا جائے گا بلکہ قانون تعزیرات لیبیا کے ماتحت سزا دی جائے گی۔

ساری دوسری سزاؤں کو ختم کر دے گی۔[۱]

دفعہ ۱۳ - دوبارہ جرم کی صورت میں

(۱) اگر مجرم نے ایسا جرم دوبارہ کیا جس پر ایک بار اس پر حد جاری ہو چکی ہے، سرقہ یا حرابہ کی شکل میں تو قتل کے جرم کے سوا، اس کو سزا جیل کی دی جائے گی[۲] اور سزا کی مدت ختم ہونے سے پہلے اسے رہا بھی کیا جا سکتا ہے اگر اس کی توبہ ظاہر ہو آگے آنے والی دفعہ (نمبر ۱۴) کے احکام کی روشنی میں۔

(۲) پھر اگر (تیسری بار) جرم کا اعادہ ہو تو اس کی سزا مؤبد (تا حیات) جیل ہو گی۔[۳]

---

[۱] سزا کی ان بیان کردہ قانونی شکلوں میں سے بعض اکثر فقہاء میں متفق ہیں اور بعض میں معمولی اختلاف ہے جن کی تفصیل اس مختصر مقالہ میں چنداں ضروری نہیں، تفصیلی مضمون ہی اس کا متحمل ہو سکے گا۔

[۲] حرابہ کے سلسلے میں تکرارِ جرم کی صورت میں تو فقہائے کرام کے نزدیک دوبارہ قطع نہ کیے جانے پر اتفاق ہے، لیکن دوبارہ چوری کرنے کی صورت میں مذاہب اربعہ میں دوبارہ بھی قطع ہے۔ لیبی مقنن نے مالکی عالم و فقیہ ابن عربی کے بیان کردہ اور تفسیر قرطبی میں بھی ابن عربی ہی کے حوالہ سے منقول، مشہور تابعی حضرت عطاء کا قول یہ نقل کیا ہے اور اسی کو آسانی کی خاطر قبول کیا گیا ہے۔ مختصراً یہ عرض کرنا ہے کہ آسان قول مذاہب اربعہ میں احناف و حنابلہ کا ہے۔ یعنی دوسری بار بایاں پیر کاٹا جائے گا۔ لیکن تیسری بار قطع نہ ہو گا۔ اس کی شرعی دلیل مفصل مضمون میں دی جائے گی۔ استنباط و قیاس کے طور پر حرابہ میں ایک پیر اور ایک ہاتھ کٹنے کے بعد پھر قطع نہ ہونا بھی ایک نظیر یا عقلی دلیل کا کام دے سکتا ہے۔ دوسرے مذاہب میں تیسری بار چور کا بایاں ہاتھ اور چوتھی بار دایاں پیر کاٹا جائے گا۔ اور بھی اقوال اس سلسلے میں موجود ہیں۔ اس مسئلہ کی مکمل تفصیل اور ائمۂ فقہ کے دلائل کتاب و سنت اور اقوال صحابہ کی روشنی میں، تبصرہ میں پیش کروں گا، کیونکہ یہ مسئلہ بھی مسئلہ نصاب کی طرح مذاہب اربعہ سے اخذ نہیں کیا گیا ہے۔

[۳] احناف کے نزدیک جب تیسری دفعہ قطع نہیں ہے تو جیل تا حیات ہے۔ لیکن اس کے ساتھ بھی توبہ کی شرط موجود ہے۔ شرح فتح القدیر میں ہے فان سرق ثالثا لایقطع بل یعزّر ویخلد فی السجن حتی یتوب او یموت (۴ - ۲۴۸)۔ لیبی مقنن نے توبہ کی یہ شرائط فقہ حنفی کی رو سے دوسری بار کے جرم میں لی ہیں جن کی تفصیل آگے آ رہی ہے، اور تیسری بار کی صورت میں تا حیات قید کی شکل اختیار کی ہے، اور توبہ یعنی دنیاوی (باقی بر صفحہ آئندہ)

دفعہ ۴ ۔ مکرر جرم کرنے والے مجرم کی توبہ سے متعلق تحقیقی کارروائیاں[۱]

(۱) دوبارہ جرم کرنے والے مجرم کو سابقہ دفعہ کے بند نمبر ا کی روشنی میں تین سال جیل میں رہنے سے قبل رہا نہیں کیا جا سکتا۔

(۲) مجرم کو اس بات کا حق ہے کہ یہ مدت (تین سال) گزر جانے کے بعد نیابت عامہ (پبلک پراسیکیوٹر) کے پاس درخواست پیش کرے جس میں سرقہ یا حرابہ سے توبہ کا اعلان ہو، پھر نیابت عامہ اس بات کی تحقیق کرے اور جیل میں اس کے چال چلن کے بارے میں متعلقہ لوگوں سے پوچھ گچھ کرے، اور یہ بھی کہ کیا اس کو رہا کرنے سے اصلاح کی امید ہے یا نہیں؟ ان تحقیقات و استفسارات کے بعد پبلک پراسیکیوٹر اپنی تحقیقات کے اوراق اپنی رائے کے ساتھ اس عدالت میں پیش کرے جہاں سے (مجرم کی سزا کا) فیصلہ صادر ہوا تھا۔

(۳) عدالت مجرم کو رہا کرنے کا فیصلہ صادر کرے گی اگر اس کے نزدیک مجرم کی توبہ ثابت ہو گئی۔ عدالت کو اس بات کا حق ہو گا کہ وہ جیل سے رہائی کے بعد کچھ مدت کے لیے اس کی نگرانی کی شرط بھی لگا دے نگرانی کی یہ مدت اس باقی مدت سے زیادہ نہیں ہو سکتی جتنی مدت کے لیے جیل کا فیصلہ عدالت نے مجرم کے حق میں پہلے صادر کیا تھا۔ (عدالت جرم سے باز رکھنے کے لیے) دوسری حفاظتی تدابیر کا حکم بھی دے سکتی ہے، بشرطیکہ وہ حریت (انسانی آزادی) کو مقید نہ کرتی ہوں۔

(۴) اگر عدالت نے (توبہ کی) درخواست نامنظور کر دی تو نامنظوری کی تاریخ سے (پورے) ایک سال تک دوبارہ (مجرم) درخواست پیش نہیں کر سکتا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) معافی اور جیل سے رہائی کی شرط ساقط کر دی ہے، تاکہ چور کے لیے دوسری بار چوری کرنے میں عدم قطع کی جو آسانی فراہم کی گئی تھی اس کا وہ ناجائز فائدہ نہ اٹھائے۔ خدا کے دربار میں معافی تو ہر وقت ممکن ہے۔ مقنن نے اس طرح مزید چوری کا دروازہ بالکل بند کر دیا۔

[۱] دراصل توبہ خدا اور بندہ کے درمیان ہوتی ہے اور یہ دل کی اس کیفیت کا نام ہے جس سے گناہ گار کو گناہ سے نفرت ہو جاتی ہے اور وہ گناہ سے باز رہنے کا عہد کرتا ہے۔ لیکن قانونی طور پر اس کی تحقیق اور تیقّن ضروری ہے اور شریعت کے اصولوں اور مصلحت کے تقاضوں کے خلاف نہیں ہے کیونکہ اس سے مقصود سوسائٹی اور فرد کی اصلاح ہے۔

(۵) عدالت سے صادر شدہ فیصلہ جو مجرم کی توبہ قبول کرنے کے بعد اس کو رہا کرنے کے لیے اس کے حق میں ہو یا (اُس کے خلاف) توبہ کی درخواست کو نا منظور کرنے کی شکل میں ہو، (دونوں صورتوں میں) اس فیصلہ پر کسی بھی اپیل کے (رائج) طریقوں کی رو سے اپیل جائز نہ ہو گی۔ (یعنی عدالت کا فیصلہ اس باب میں آخری ہو گا اور کسی دوسری عدالت میں اس کے خلاف اپیل دائر نہ ہو سکے گی)۔

دفعہ ۱۵- حد والے جرم ایک خاص مدت گزرنے سے ساقط ہو جائیں گے[۱]

---

[۱] لیبی مقنن نے مدت گزرنے سے حد ساقط ہو جانے کا نظریہ فقہ حنفی سے اخذ کیا ہے۔ اصل وجہ یہ ہے کہ مدت گزر جانے کی وجہ سے گواہی میں شک پڑ جاتا ہے، اور یہ شک حد کو ختم کرنے کے لیے کافی ہے۔ لیکن مال کا ضمان ہو گا وجہ یہ ہے کہ ایک مسلمان شخص جب کسی چور کو چوری کرتے دیکھتا ہے تو اس پر دو حالتوں میں سے کسی بھی ایک حالت پر عمل کرنا درست ہے۔ ایک تو یہ کہ "مَنْ سَتَرَ مُسْلِمًا سَتَرَهُ اللّٰهُ" کے پیش نظر وہ اس کی اطلاع نہ کرے۔ اس حالت میں بھی وہ گناہ گار نہیں، دوسری یہ کہ چوری کی کثرت ہو جانے، یا چوری سے نفرت ہونے یا سوسائٹی کو برائیوں سے پاک کرنے کی غرض سے فوراً اس کی اطلاع کرے اور اپنی گواہی دے۔ اس صورت میں بھی وہ گناہ گار نہیں۔ ان دونوں صورتوں میں سے جو صورت بھی اس نے اختیار کر لی گویا وہ اپنے واجب سے سبکدوش ہو گیا۔ لیکن اُس وقت تو چور کی چوری کو چھپا لیا اور اطلاع اور گواہی نہ دی لیکن دس سال گزر جانے کے بعد اس کی اطلاع دی۔ اس سے یہ شک واقع ہو جاتا ہے کہ گواہ نے اب یہ عمل نہ اس شخص کے فائدہ کے لیے کیا ہے جس کی چوری ہوئی، اور نہ اُس وقت کی خاموشی مجرم کی ستر پوشی کی غرض سے تھی، بلکہ اب کسی کینہ یا حسد یا مخالفت یا عداوت کی بنا پر وہ یہ گواہی دے رہا ہے۔ اس طرح گواہی میں شبہ پڑ جاتا ہے، اور حدود چھوٹے سے چھوٹے شبہ سے بھی ختم ہو جاتی ہیں۔ لیبی مقنن نے مدت کی تحدید امام ابو حنیفہ کے اس قول کی بنا پر کی ہے کہ "قاضی کو ہر زمانہ اور ہر جگہ عرف و حالات کے مطابق یہ مدت مقرر کرنے کا حق ہے۔" فقہ حنفی میں شرح فتح القدیر کے بیان کے مطابق امام محمد کا قول ایک ماہ کا ہے، اور لکھا ہے کہ ایک روایت امام ابو حنیفہ و ابو یوسف سے بھی یہ ہے اور لکھا ہے کہ "و ہو الاصح"۔ امام محمد نے الجامع الصغیر میں مدت چھ ماہ رکھی ہے اور یہ بھی اقرب الی الصحۃ اور معقول ہے۔ قدیم زمانے میں اسلامی نظام قضاء میں مقدمات اس قدر طویل نہیں ہوتے تھے جس قدر اب یورپ سے آئے ہوئے نظام عدالت میں ہیں، جن کی رو سے ایک ایک دعویٰ سالہا سال تک عدالتوں کے چکر کاٹتا رہتا ہے۔ مگر اب یہ چھ ماہ کی مدت بھی کافی نہیں اس لیے مجتہد اور مقنن (باقی بر صفحہ آئندہ)

یہ دونوں جرم جن پر اس قانون کی رو سے حد واجب ہوگی، ان پر سے حد ساقط ہو جائے گی اگر ارتکاب جرم پر پورے دس سال گزر گئے ہوں۔ اور یہ اس صورت میں کہ مجرم خود اعتراف جرم نہ کرے، اور یہ مدت پوری ہوگی ان احکام کے مطابق جو (لیبی) قانون تعزیرات میں مقرر ہیں۔

دفعہ ۱۶۔ حدود کی سزائیں مدت گزر جانے سے ساقط ہو جائیں گی

(۱) وہ حدود جو اس قانون میں بیان کی گئی ہیں بیس سال گزر جانے سے ساقط ہو جائیں گی، لیکن صرف قتل کی سزا تیس سال بعد ساقط ہوگی۔ اور یہ سب اس صورت میں جب کہ (عدالت) کا صادر شدہ فیصلہ مجرم کے اقرار و اعتراف سے نہ ہو (مطلب یہ ہوا کہ مجرم کے اقرار سے ثابت شدہ حد ساقط نہ ہوگی)[۵۱]۔

(۲) حد ساقط ہونے کی مدت (عدالت کے) آخری فیصلے کے بعد شروع ہوگی۔

(۳) ہر وہ مانع جو (حد) کو نافذ کرنے کی راہ میں پیش آ گیا ہو وہ مدت میں محسوب نہ ہوگا[۵۲]۔

دفعہ ۱۷۔ عقوبات حدود کی قطعیت اور لزوم

اس قانون میں منصوص حدود کی سزاؤں کو نافذ کرنے سے روکنے، یا ان کو بدلنے، یا ان میں کمی کرنے اور معاف کرنے کا فیصلہ (کسی کی طرف سے بھی) جائز نہیں ہے۔

دفعہ ۱۸۔ فیصلہ کو عدالت عالیہ میں پیش کرنا۔

تعزیری احکام میں مقررہ اپیل کے طریقوں اور قاعدوں میں استثناء کے ساتھ[۵۳]:

(بقیہ صفحہ سابقہ) تو مدت کے تعین کا حق ضرور ہے جیسا کہ امام اعظم کے قول میں موجود ہے۔ کیونکہ پولیس، پبلک پراسیکیوٹر، چھوٹی عدالتیں، ہائی کورٹ، سپریم کورٹ وغیرہ کا طویل طریقہ موجود ہے۔ لیکن گواہی اور گواہوں سے متعلق احناف کی عقلی اور واقعاتی دلیل کی رو سے مدت بہت زیادہ نہ ہونی چاہیے۔

۵۱ اعتراف کی صورت میں حد مدت گزرنے سے ساقط نہ ہوگی یہ جمہور فقہاء امت کا قول ہے۔

۵۲ یہ تین صورتیں ہیں۔ پولیس یا عدالت تک کیس ہی نہ پہنچا ہو تو جرم دس سال میں ختم ہو جائے گا۔ فیصلہ صادر ہوا مجرم کی عدم موجودگی میں یا مجرم فیصلے کے بعد بھاگ گیا تو قتل کے سوا سزا بیس سال میں ختم ہو جائے گی۔ تیسری شکل یہ کہ بیماری وغیرہ جیسے کسی مانع کی رو سے سزا میں تاخیر ہوئی تو تاخیر کی یہ مدت محسوب نہ ہوگی۔

۵۳ یہ مقررہ طریقے بعد میں بیان کروں گا، یہاں اتنا بتانا چاہتا ہوں کہ براہ راست (باقی بر صفحہ آئندہ)

(۱) اگر مجرم کی موجودگی میں حد کا فیصلہ صادر ہوا ہے، ان دونوں جرموں میں سے کسی ایک پر جو اس قانون کی دفعہ ا و ۴ میں بیان ہوئے ہیں، تو عدالت عالیہ کے سامنے اس مقدمہ کے تمام اوراق فیصلہ کے چالیس دن کے اندر پیش کرنے ضروری ہیں، اور عدالت مجرم کے لیے وکیل کا بندوبست بھی کرے اگر اس کا دفاع کرنے والا کوئی نہیں ہے، اور پبلک پراسکیوٹر اپنی رائے اور رپورٹ مقدمہ پیش کرنے کے بعد پندرہ دن کے اندر پیش کرے، اور مجرم کے وکیل کو اس کے پندرہ دن بعد اپنا دفاع پیش کرنا ہوگا۔

(۲) عدالت عالیہ اس قضیہ میں قانونی اور موضوعی (قانون کی دیکھ بھال اور اس خصوصی مقدمہ کی مکمل تفصیلی تحقیق کے بعد) فیصلہ کرے گی، اور اس کا یہ فیصلہ آخری ہوگا۔

دفعہ ۱۹ - حد کی تنفیذ

حد کا حکم اس وقت تک نافذ نہیں ہو سکتا جب تک عدالتِ عالیہ اس مقدمے کا فیصلہ نہ کر دے۔

دفعہ ۲۰ - حد کی صورت میں قتل اور جیل کی تنفیذ کی صورت

قتل اور جیل کے حکم کی تنفیذ جو اس قانون میں مقرر کی گئی ہے وہ اُن اصولوں اور طریقوں پر ہوگی جو (لیبی قانون میں) موت کی سزا اور جیل سے متعلق نافذ ہیں۔

دفعہ ۲۱ - قطع (ہاتھ یا پیر کاٹنے) کی سزا کی تنفیذ

اس قانون کی دفعہ ۲ و ۵ میں وارد قطع کی سزا اس طرح نافذ کی جائے گی۔

(۱) (حد) کی تنفیذ سے پہلے (یعنی جس دن حد نافذ ہونے والی ہو اس کے مقررہ وقت سے بالکل متصل) محکوم علیہ کا طبی معائنہ ضروری ہے جو سرکاری ڈاکٹر کرے گا، تاکہ وہ یہ رپورٹ پیش کرے کہ تنفیذ حکم کی وجہ سے کوئی خطرناک صورت تو پیش نہیں آ سکتی، کسی بیماری کی وجہ سے، یا حاملہ ہونے کی وجہ سے یا کسی اور سبب سے، اور اگر ڈاکٹر کی رائے یہ ہو کہ تنفیذ حکم میں تاخیر ہو تو اسے

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) عدالت عالیہ میں اپیل کے کاغذات پیش کرنا لیبی مقنن نے ضروری قرار دیا ہے اگرچہ کہ مجرم اپیل نہ بھی کرے، کیونکہ یہ حد کا معاملہ ہے اور عدالت عالیہ کی تصدیق یا فیصلے کے بغیر اس کا نفاذ نہیں ہو سکتا۔

تاخیر کی مدت کا تعین کرنا ضروری ہوگا۔[۵۱]

(۲) قطع کا حکم جیل کے ہسپتال یا عمومی ہسپتال (کسی بھی سرکاری حکومت کے ہسپتال میں) اسپشلسٹ ڈاکٹر (سرجن) کے ذریعہ اور آپریشن کے طریقے پر، اور اُن مناسب طبی طریقوں (سہولتوں) کے استعمال کے ساتھ نافذ ہوگا جس میں محکوم علیہ کو بے حس کرنا بھی شامل ہے۔[۵۲]

(باقی)

---

[۵۱] یہ احتیاط شریعت مطہرہ کے اصولوں اور مصلحت عامہ کے تمام عقلی و فطری تقاضوں کی رو سے انتہائی ضروری اور معقول ہے۔

[۵۲] مقنن نے یہ سہولتیں اس لیے رکھی ہیں کہ حد کا مقصود برائی سے روکنا، اور ڈرانا ہے، ہلاک کرنا یا تلف کرنا نہیں ہے۔ المغنی لابن قدامہ میں لکھا ہے کہ حد آسان اور سہل ترین طریقے پر نافذ ہوگی۔ یہ سہولت اور آسانی شرعی طور پر بالکل صحیح ہے۔ مقنن نے ہسپتال میں حد کا نفاذ رکھا ہے۔ اس بات کی تصریح قانون یا یادداشت میں مجھے نہیں ملی کہ کیا عوام الناس اس پر قیام حد کو دیکھیں گے یا نہیں، چاہے وہ ہسپتال ہی میں کیوں نہ جمع ہوں؟ قیام حد جس طرح مجرم کو دوبارہ اس فعل شنیع سے باز رکھنے کا ذریعہ ہے اسی طرح وہ پوری سوسائیٹی اور عوام الناس کو بھی برائی سے روکنے اور باز رکھنے کا فطری طریقہ ہے اور محض قطع کی خبر اخبار میں پڑھتے یا ریڈیو پر سننے سے شاید وہ تاثر اور چوری سے خوف، نفرت اور نفسیاتی انفعال نہ ہو جو بذات خود اس کا مشاہدہ کرنے سے ہو۔ لیکن بہت ممکن ہے کہ عصر حاضر میں ٹیلی وژن، مووی اصلاحی فلمیں اور سینما اس تاثر، انفعال اور خوف و زجر کے جذبات پیدا کرنے میں مدد کرے اور اس طرح شریعت کا منشا پورا ہو۔

تحریکِ اسلامی کی شناخت

(از سید اسعد گیلانی صاحب)

بنی نوع انسان کے لیے امن وسکون اور فوز و فلاح کا واحد راستہ اللہ کا دیا ہوا نظام زندگی ہے جب فلاحِ انسانیت کا یہ نظام قائم نہ ہو اور ابنِ آدم صراطِ مستقیم سے محروم بدنصیبی کی ٹھوکریں کھا رہا ہو تو اللہ کی مشیت کسی تحریک اسلامی کے برپا ہونے کا انتظام کر دیتی ہے اور جب کوئی تحریک اسلامی کسی قوم میں اللہ کے دین کا علم لے کر اٹھتی ہے تو وہ قوم آزمائش کی میزان میں رکھ دی جاتی ہے۔ اس لیے کہ اس تحریک کے ساتھ قوم کے طرز عمل پر ہی پھر اس قوم کے مستقبل کی درخشانی یا تاریکی کا انحصار ہو جاتا ہے۔ تحریک اسلامی کے برپا ہو جانے کے بعد اس سے بے خبری محرومی، اس سے بے نیازی بدنصیبی، اور اس کی مخالفت بدترین بدبختی ہوتی ہیں۔ اس لیے کسی قوم کے اندر مختلف اجتماعی تنظیموں کے مقابلے میں تحریک اسلامی کی شناخت انتہائی ضروری ہوتی ہے کیونکہ قوم کا اس تحریک کے ساتھ طرز عمل ہی درحقیقت اس قوم کی بلندی و پستی کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ افراد کی غلطیوں سے نقصان وخسران کا دائرہ محدود ہوتا ہے۔ لیکن قوموں کی غلطیاں ان کے لیے عظیم خسران کا سبب بن جاتی ہیں۔ بقول علامہ اقبالؒ:

فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے

پر نہیں کرتی ہے قوموں کے گناہوں کو معاف

اس لیے تحریک اسلامی کی شناخت کا مسئلہ ہر قوم اور اس قوم کے ہر فرد کے لیے نہایت اہم مسئلہ ہے۔ اگرچہ کسی معاشرے میں برپا ہونے والی ایک اسلامی تحریک کی شناخت کچھ مشکل بھی نہیں ہے جس طرح تاریکی میں چمکتی ہوئی روشنی کو اور آسمان میں درخشاں چاند کو شناخت کرنا کچھ دشوار کام نہیں ہوتا ہے۔

دنیا کی تمام نفسانی تحریکوں کے مقابلے میں اسلامی تحریک ایک روحانی اور الٰہی تحریک ہے جس کے بنیادی اصول اللہ کی بھیجی ہوئی تعلیمات پر مشتمل ہوتے ہیں۔ تاریخی لحاظ سے بھی انسانی معاشرے میں یہ قدیم ترین تحریک ہے۔

انسانی ضمیر اس تحریک کے عمومی خدوخال سے آگاہ، اس کے انداز بیان سے واقف اور اس کے طرز عمل سے باخبر ہے۔ اس کے برپا ہوتے ہی ہر شخص اس کی انفرادیت اور اٹھان سے فوراً اسے پہچان لیتا ہے۔ پھر یہ معاملہ توفیقِ الٰہی، فطرتِ انسانی اور افراد کی اُفتادِ طبع کے مجموعی طرزِ عمل پر مبنی ہوتا ہے کہ بھٹکا ہوا انسان آغوشِ مادر کی طرف لوٹتا ہے یا قسمت کے دھکے اسے کسی اور سمت دھکیل کر لے جاتے ہیں۔

دوسری تمام تحریکوں کے مقابلے میں چند پہلوؤں سے یہ تحریک امتیازی نشانات رکھتی ہے۔ کائنات کے لیے خالق کی موجودگی کا اعتراف اور اس کی بندگی کی طرف دعوت اس تحریک کا طرۂ امتیاز ہے۔ یہ پوری انسانیت کو چاہے وہ سفید ہو یا سیاہ، سرخ ہو یا زرد، جغرافیائی حدبندیوں سے بالاتر ہو کر آدم کے بیٹوں کی حیثیت سے یکساں سطح سے مخاطب کرتی ہے اور ان میں نسلی کوئی فرق نہیں کرتی۔ یہ انسان کی فطرت کی آواز ہے اور ہر انسانی معاشرے کا پاکیزہ فطرت گروہ فوراً انس و محبت کے ساتھ اس کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے، اور بگڑی ہوئی فطرت والا بدکردار طبقہ اسے اپنے لیے خطرہ سمجھ کر غم و غصہ سے اس کی سرگرمیوں کی طرف دیکھنے لگتا ہے۔ آج بھی انسانوں کی بستیوں اور آبادیوں میں نیکی، بھلائی اور شرافت کا جو بکھرا ہوا سرمایہ پایا جاتا ہے وہ تاریخ کے مختلف ادوار میں اسی تحریک کی چھوڑی ہوئی پاکیزہ میراث ہے۔ وحدتِ انسانیت، وحدتِ کائنات اور وحدتِ اِلٰہ اس تحریک کا معروف نعرہ ہے۔ یہ تحریک جس قوم میں بھی برپا ہو اس میں اس کی حیثیت قوم کی ریڑھ کی ہڈی کی ہوتی اور دنیا کی خرابیوں کا علاج اسی کی تنظیم اور پروگرام میں پوشیدہ ہوتا ہے۔ تحریک اسلامی کی تنظیم کے بارے میں دورِ حاضر کی تحریک اسلامی کے بانی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے خوب کہا ہے کہ:

> "دنیا کی خرابی کا علاج یہ ہے کہ صالحین کی ایک جماعت منظم کی جائے جو خدا ترس بھی ہو، راستباز اور دیانتدار بھی۔ خدا کے پسندیدہ اوصاف و اخلاق سے آراستہ ہو اور اس کے ساتھ دنیا کے حالات کو دنیاداروں سے زیادہ اچھی طرح سمجھے اور خود دنیاداری میں اپنی مہارت و قابلیت سے ان کو شکست دے سکے۔ بداخلاق اور بے اصول لوگوں کے لیے دنیا کی چراگاہ میں بس اسی وقت تک چرچگ لینے کی مہلت ہے جب تک ایسا ایک گروہ تیار نہیں ہو جاتا۔ اس کی تیاری کے بعد فساق و فجار کا چراغ اس کے سامنے جل نہ سکے گا...... یہ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ انقلاب کس طرح رونما ہوگا۔ لیکن جس طرح مجھے کل سورج کے طلوع ہونے کا یقین

ہے اتنا ہی اس بات کا یقین بھی رہے کہ یہ انقلاب بہر حال رونما ہو کر رہے گا۔"

اب میں اس تحریک کے نمایاں ترین خدوخال ترتیب وار بیان کرتا ہوں تاکہ ایسی اہم تحریک کی شناخت کرنے میں کسی کو بھی کوئی شک وشبہ لاحق نہ ہو۔ چونکہ انسانیت کی فلاح اور خسران اس تحریک کی شناخت پر مبنی ہے۔

حاکمیت کا تصور ہر تحریک میں اہم ترین چیز اس کے اندر حاکمیت کا تصور ہوتا ہے کیونکہ ہر تحریک ایک ریاست کی تشکیل کی طرف اقدام کرتی ہے اور ایک ریاست اور نظم اجتماعی معاشرے میں حاکمیت کا تصور اس کی ساری اجتماعی زندگی تہذیب وتمدن، تعلیم وتربیت اور انفرادی واجتماعی کردار کی صورت گری کرتا ہے۔ اسلامی تحریک دنیا کی واحد تحریک ہے جو حقیقی طور پر اپنے خالص اور بے آمیز عقیدے سے اللہ کی حاکمیت کی علمبردار ہے۔ دنیا میں حاکمیت کے تمام تصورات میں یہ ایک انوکھا تصور ہے۔ دنیا کی تمام دوسری تحریکیں حاکمیت کو تقسیم کرتی ہیں۔ کوئی رنگ نسل قبیلہ افراد گروہ اور خاندان میں اسے محدود کرتی ہے اور کوئی کسی خاص طبقہ کے لیے اسے مخصوص کرتی ہے۔ لیکن اسلامی تحریک ہی وہ واحد تحریک ہے جو حاکمیت کو صرف خدا کے لیے وقف کرنے کا اعلان کرتی ہے اور سارے اختیارات کا سرچشمہ اسی کی ذات کو قرار دے کر بندوں کے لیے نیابت کا اصول پیش کرتی ہے۔

اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ	بے شک اختیار اللہ کے سوا کسی کا نہیں ہے
اَلَا لَہُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ	خبردار! خلق بھی اللہ ہی کی ہے اور حکم بھی اسی کا۔

یہ وہ واضح طرز عمل اور استدلال کی بنیاد ہے جس پر اسلامی تحریک میں حاکمیت کا مسئلہ طے ہوتا ہے۔ اور اسی تصور کے اندر سے اسلامی تحریک کا نصب العین، طریق کار، پروگرام، اخلاق، نظام تربیت اور کارکنوں کے اوصاف نمودار ہوتے ہیں۔

مقام رسالت اسلامی تحریک میں حاکمیت کا مقام ایک بالاتر ذات اور مالک الملک ہستی کے حوالے ہونے کے بعد احکام کے حصول اور اطاعت کے نظام کو مربوط کرنے کا واحد ذریعہ تحریک میں رسالت کا تصور ہے۔ یعنی حقیقی بادشاہ اور حاکم اعلیٰ کا نمائندہ، جو بندوں کے مالک اور بادشاہ کا پیغام اُن تک پہنچائے۔ اُس کی مرضی سے اُن کو آگاہ کرے اور یہ بتائے کہ وہ کن باتوں سے روکتا ہے اور کن باتوں پر عمل پیرا ہونے کا حکم دیتا ہے۔ اس سے آگاہی کے لیے خدا کا نمائندہ رسول ہے اور وحی والہام خدائی پیغام پہنچنے کا ذریعہ ہے۔ اسی لیے سب سے پہلے یہ بات رسول ہی جانتا ہے کہ حاکم اعلیٰ نے کیا حکم دیا ہے اور کس بات سے منع کیا ہے۔ اور وہ اپنی رعایا سے کس طرز عمل کا طالب ہے۔ اسی کے پیش نظر رسول کی بلاچون وچرا اطاعت ایمان کے لیے شرط اول

ہے اور اس سے محبت اور اس پر مال وجان قربان کر دینے کا پختہ عزم ایمان کی شرائط میں شامل ہے۔ اس سلسلے میں حاکم اعلیٰ نے رسول کی بالاتر پوزیشن کو خود واضح کر دیا ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ۔ ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے اس لیے بھیجا ہے کہ اللہ کے اذن سے اس کی اطاعت کی جائے۔

اس لیے تحریک اسلامی کا حقیقی رہنما رسول ہی ہوتا ہے۔ اور حضور نبی کریمؐ کی وفات کے بعد بھی قیامت تک حضورؐ ہی ہر دور کی اسلامی تحریک کے حقیقی رہنما ہیں اور انہیں کے احکام اور ارشادات، طرزِ عمل اور اسوۂ مبارکہ کو اسلامی تحریک کے پروگرام میں حجت اور سند کی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ رسول کی شخصی غیر موجودگی میں وہی شخص ایسی تحریک کا رہنما اور قائد ہو سکتا ہے جو خدا کے احکام اور رسول کی تعلیمات پر سب سے زیادہ عمل پیرا ہو اور خدا اور رسولؐ کے دیے ہوئے نظامِ زندگی کا سب سے بہتر فہم رکھتا اور دین کی حکمت اور تدبیرِ کار سے آگاہ ہو۔

خلافت انسانی اسلامی تحریک میں انسان کا تصور یہ نہیں ہے کہ وہ حیوانات کی مختلف انواع میں سے تبدریج ترقی کرتا ہوا بالآخر انسان بن گیا ہے بلکہ یہ ہے کہ انسان کو اول روز ہی انسان اور اشرف المخلوقات بنا کر پیدا کیا گیا ہے۔ اور اسے براہ راست تخلیقِ ربانی کے ذریعے نیکی اور بدی کا علم، ذوق ضمیر اور فطرت دے کر بھیجا گیا ہے اسے زمین پر خدا کا خلیفہ مقرر کیا گیا ہے اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً۔ اور اس کا مقصدِ زندگی یہ قرار دیا گیا ہے کہ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اپنے حقیقی بادشاہ کے تمام احکام کو نافذ کرے اور ساری دنیا میں ان کے نفاذ کی جدوجہد کرے۔ یہ جدوجہد ہی اس کے ذمے اس کے خالق اور مالک کا حقِ بندگی ہے اور اسی جدوجہد میں اس کی وفاداری اور غداری کا امتحان ہے۔

تصور مملکت اسلامی تحریک کا تصورِ مملکت یہ ہے کہ:

—— وہ خدا پرستانہ نظامِ زندگی کی علمبردار ہوتی ہے اور اس کا مقصدِ وجود ہی خدا پرستی کو زندگی کے تمام دائروں میں جاری و ساری کرنا ہوتا ہے۔

—— وہ شرفِ انسانیت پر مبنی بین الانسانی مملکت ہوتی ہے جس میں تمام انسانوں کے لیے تمام بنیادی حقوق مساوی ہوتے ہیں، اس کے ماننے والوں کے لیے بھی اور نہ ماننے والوں کے لیے بھی۔ البتہ ریاست کو چلانے کی ذمہ داری اس کے اصولوں کے ماننے والوں پر ہی فطری طور پر ڈالی جا سکتی ہے۔

—— اس کا نظامِ سیاست تمام تر جمہوری ہوتا ہے جس میں وہ حدود الٰہیہ کے اندر عوام کے حقوق

اور ان کی رائے کو خصوصی اہمیت حاصل ہوتی ہے اور ان کی بہبود ریاست کے اولین فرائض میں شامل ہوتی ہے۔

——— یہ کلیتہً خود مختار ریاست نہیں ہوتی بلکہ خدا کے بالاتر احکام کے تابع خلافتِ ربانی ہوتی ہے جس میں ملک کے تمام باشندے مل کر بھی الٰہی قوانین میں کوئی تغیر و تبدل نہیں کر سکتے کیونکہ اس کی حیثیت حاکم مطلق کی نہیں بلکہ خلیفہ کی ہوتی ہے اور اسی طرز عمل سے اسلامی تحریک کی قائم کردہ ریاست کی جمہوریت اور مغرب کی جمہوریت میں جوہری فرق واقع ہو جاتا ہے۔

تحریک کا نصب العین ایک اسلامی تحریک کا نصب العین ہمیشہ دنیا میں اسلامی نظام کا قیام اور آخرت میں رضائے الٰہی کا حصول ہوتا ہے۔ اس تحریک کے نزدیک انسانی زندگی کا خاتمہ قبر کے کنارے پر نہیں ہوتا بلکہ وہاں سے انسانی زندگی کا دوسرا مستقل دور شروع ہوتا ہے۔ اسلامی تحریک اپنے نصب العین کی وسعت کے اعتبار سے دنیا سے آخرت تک محیط ہے اور اس کے نصب العین کا ایک حیرت انگیز پہلو یہ ہے کہ وہ انسان کو اطمینانِ قلبی سے بھر دیتی ہے۔

معاشرے میں تحریک کا مقام انسانی معاشرے میں اسلامی تحریک کا مقام نقطۂ اعتدال پر ہے۔ یہ گروہ اُمتِ وَسَط کہلاتا ہے۔ اپنے پروگرام، طرز عمل، کردار اور تعلیمات کے اعتبار سے یہ تحریک انسانی ضمیر کے انتہائی معتدل اور متوسط مقام پر واقع ہے۔ ہر معاشرے کے سعید فطرت افراد اس کی طرف نہایت آسانی سے کھینچ کر آجاتے ہیں۔ جو کسی قسم کے تعصبات میں مبتلا نہیں ہوتے، نظام باطل کے چہیتے نہیں ہوتے، اپنی قوت بازو سے حلال رزق کماتے اور شریفانہ زندگی گزارتے ہیں، وہ سب نہایت آسانی سے اس کی گود میں آجاتے ہیں۔ اسی لیے ہر نظامِ باطل اپنے دائرے میں ایسے افراد کا مسلسل قلع قمع کرتا رہتا ہے تاکہ اسلامی تحریک کو کارکن فراہم نہ ہو سکیں۔ لیکن تخلیق کے عمل میں باطل کا کوئی دخل نہیں ہے۔

جب کسی معاشرے میں کوئی اسلامی تحریک اٹھتی ہے تو اس کی مخالفت ہر طرف سے ہوتی ہے۔ انتہائی دنیادار اور بگڑے ہوئے افراد کی طرف سے اس کی مخالفت ایک فطری بات ہے۔ نظام باطل کے سربراہوں کی طرف سے حملہ ہونا بھی ناگزیر ہے۔ لیکن مذہبی طبقوں میں بھی ایک خاص تعداد اس کی مخالفت کے لیے ہمیشہ ضرور ہی نکلتی ہے اس کی ایک وجہ یہ ہوتی ہے کہ نظام باطل اپنے غلبے کے زور سے معاشرے کے ہر طبقے میں سے اپنا حصہ وصول کرتا ہے اور جب کوئی معاشرہ باطل کے سامنے گھٹنے ٹیک کر اس کی سیادت و فرمانروائی پر راضی ہو چکا ہو تو ظاہر

ہے کہ باطل اپنے زور اور زر دونوں ذرائع سے ہر بستی اور معاشرے کے ہر طبقے میں سے اپنے مطلب کے آدمی برآمد کر لیتا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہوتی ہے کہ باطل کا غلبہ ہر طبقہ کو نقطۂ اعتدال سے ہٹا دیتا ہے۔ چونکہ باطل معاشرے میں بحیثیت مجموعی افراط و تفریط اور فساد پیدا کئے بغیر نہیں رہ سکتا اس لیے جب کبھی ایک اسلامی تحریک نمودار ہوتی ہے جو ہمیشہ نقطۂ اعتدال پر کھڑی ہوتی ہے اور اسی مقام سے اپنے کام کا آغاز کرتی ہے تو دنیاداروں سے لے کر مذہبی لوگوں تک ہر ایک اُسے اپنے مقام انحراف سے ہی دیکھتا ہے اور اسے اپنے سے مختلف پا کر اختلاف کرتا ہے اُس کا اپنا مقام انحراف ہی اس کا نقطۂ اختلاف بن جاتا ہے۔ اس لیے ایک تحریک کے اسلامی ہونے کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ بڑے بڑے پرانے باہمی مخالف گروہ اس کی مخالفت میں ہم آواز ہو جاتے ہیں۔ یہ حیرت انگیز تضاد کھل کر بہت جلد سامنے آ جاتا ہے اور اس تضاد کو دیکھ کر ہی ہر سلیم الطبع شخص تحریک اسلامی کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔

نظام اطاعت تحریک اسلامی میں جہاں اطاعتِ امر عبادتِ الٰہی کے دائرے میں شامل اور کارِ ثواب ہے وہاں اسے معروف کے ساتھ مشروط بھی کر دیا گیا ہے۔ اور معروف وہ ہے جو خدا اور رسولؐ کے احکام سے ثابت ہو۔ اس لیے اسلامی تحریک کا نظام جماعت جہاں بہترین مطیع فرمان کارکن فراہم کر لیتا ہے جو اپنی آخرت کے نقطۂ نظر سے سخت سے سخت احکام سنتے اور مانتے ہیں، وہاں ایسے باشعور کارکن بھی تیار کرتا ہے۔ جو تحریک کی قیادت کو راہِ مستقیم سے منحرف نہیں ہونے دیتے۔ آنکھیں کھول کر اس کے پورے طرزِ عمل کا جائزہ لیتے رہتے ہیں اور اپنے علم و فراست کی روشنی میں اسے تولتے رہتے ہیں اور جہاں اسے جادۂ معروف سے ذرا بھی ہٹتے ہوئے دیکھتے ہیں وہاں ایک طرف اُس کی اطاعت سے انکار کر دیتے ہیں اور دوسری طرف اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے سیدھے راستے پر قائم کر دیتے ہیں۔ یہ وہ خوبی اور قوت ہے جو کسی دوسری تحریک کو حاصل نہیں ہوتی کہ رہنمائی آگے سے بھی ہوتی ہے اور نگرانی پیچھے سے بھی ہوتی ہے اور مل جل کر پوری ہوشمندی کے ساتھ نصب العین کی منزل کی طرف پیش قدمی کی جاتی ہے۔

شورائی نظام تحریک اسلامی میں سارے ہی کام مشورے سے طے کیے جاتے ہیں اور پورا نظام جماعت اس طرح مرتب کیا جاتا ہے کہ مشورے کا اہتمام نیچے سے اوپر تک برابر قائم رہتا ہے۔ اس لیے کہ مومنین کی صفت ہی یہ بیان کی گئی ہے کہ: وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ اور یہ کہ أَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ۔ چنانچہ وہ اپنے سارے معاملات ہر سطح پر مشورے سے طے کرتے ہیں، اسی میں وہ تائید ربانی اور برکت محسوس کرتے ہیں، اور

مشترکہ ذمہ داری سے ہی بہترین اجتماعی نتائج برآمد ہوتے ہیں اور مل جل کر کام کرنے کا داعیہ اور جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

معیارِ فضیلت اس تحریک میں عام دنیوی تحریکوں کے معیاراتِ قیادت کے مقابلے میں افراد کی فضیلت اور رہنمائی کا معیار بالکل ہی مختلف ہے۔ دوسروں کے ہاں جاگیر، مال، موٹر، مکانات، شہرت، سرداری، نسل، جتھہ بندی اور اقتدار بڑائی کا معیار ہے۔ لیکن اسلامی تحریک میں یہ سارے معیار پست شمار ہوتے ہیں۔ یہاں کا معیار ہے اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ۔ جو سب سے زیادہ خدا سے ڈرنے والا، دین کا خادم، رسولؐ کا سچا پیروکار اور سب سے بڑھ کر ایثار و قربانی کرنے اور اس راہ میں جان کھپانے والا ہے وہی مقامِ رہنمائی پہ فائز ہوتا ہے اور اسی معیار سے رہنمائی کے سارے مقام پُر کیے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ دوسرا ہر معیار جاہلی معیار تصور ہوتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ باطل میں بلند مناصب پہ فائز لوگوں کے لیے بالعموم فقراء کی اس تحریک کے اندر داخل ہونے میں بڑی رکاوٹیں پیش آتی ہیں اور بنی بنائی شخصیتوں کے بُت راستہ روک کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جو شخص شخصیت کے اس بت کو خود اپنے ایثار و قربانی کے گرز سے توڑ کر آگے آسکتا ہے اس کے لیے فضیلت کے راستے کھل جاتے ہیں اور جو اپنی باطل کی بنائی ہوئی شخصیت کو ہمراہ لے کر آنا چاہتا ہے وہ برسوں تحریک کے دروازے پہ ہی بیٹھا رہتا ہے اور اسے دروازے کے اندر قدم رکھنے کی توفیق نصیب نہیں ہوتی۔

مناصب کی کشمکش سے پاک اجتماعیت دنیا میں ایک اسلامی تحریک ہی واحد گروہ ہے جو مناصب کی کشمکش سے پاک اجتماعی نظام رکھتا ہے۔ یہاں منصب کی طلب نااہلی کی علامت اور خدا کی تائید سے محروم کر دینے والی نحوست ہے یہاں کہنی مار کر آگے بڑھنے والوں کے لیے کوئی مقام نہیں ہے۔ یہاں قربانی کرنے والوں اور بے لوث، بے غرض اور بے نفس لوگوں کی قدر و قیمت ہے۔ یہاں مسجد میں خدا کے حضور صف بندی کا ماحول ہے۔ جو پہلے آیا پاکیزگیٔ قلب سے آیا وہ آگے کھڑا ہوگا۔ جو بعد میں آیا پیچھے ہوگا۔ پھر اپنی اپنی صفات کے زور سے ترقی کر کے وہ تحریک کی سربراہی کے مقام تک بھی پہنچ سکتا ہے یہاں وہ شخص سب سے زیادہ غیر موزوں اور تحریک کی روح کو برباد کر دینے والا ہے جو منصب کی طلب رکھے۔ یہاں کا ماحول گروہ بندی جتھہ بندی اور جوڑ توڑ سے پاک صاف ماحول ہوتا ہے۔ اور ایسی فضا کا ہرگز متحمل نہیں ہو سکتا۔

تحریک کا رہنما کردار تحریک اسلامی میں محض چرب زبانی، کھوکھلے وعدوں اور دعووں سے کام نہیں چلتا بلکہ ٹھوس کام مطلوب ہوتا ہے۔ اُس کا رہنما کردار ہمیشہ عزیمت کا پیکر ہوتا ہے اور اس کی نگاہ اپنے بلند تر مِن نصب العین کے حصول پر جمی رہتی ہے۔ درمیانی مراحل کی کوئی مصیبت یا کسی دنیوی منصب کا لالچ نہ اُسے اپنے

مقام عزیمت سے ہٹا سکتا ہے اور نہ الجھا سکتا ہے۔ حضورؐ کے پاس قریش کا وفد اقتدار، زر، اور زن کی پیش کش لے کر آتا ہے تو یہ جواب پاتا ہے:

"اگر تم میرے ایک ہاتھ پر چاند اور دوسرے پر سورج بھی لاکر رکھ دو تو میں اس کام سے باز نہ آؤں گا یا یہ کام تکمیل کو پہنچے گا یا میری جان اس راہ میں کھپ جائے گی"۔

تحریک مجاہدین کا رہنما ان الفاظ میں اپنی بے لوث فداکاری کا اظہار کرتا ہے۔

"میں ہفت اقلیم کی سلطانی کو پرِکاہ کے برابر بھی وقعت نہیں دیتا۔ جب نصرتِ دین کا دور شروع ہوگا اور خدا کے سرکشوں کی جڑ کٹ جائے گی تو میری سعی کا تیر خود بخود نشانہ مراد پر جا بیٹھے گا۔ میں نے خدا کے سوا ہر چیز کی طرف سے آنکھیں اور کان بند کر لیے ہیں۔ خدا کے سوا کسی کی جستجو اور خوشنودی کی طلب نہیں رہی۔ تاجِ فریدوں اور تختِ سکندر میری نظروں میں جو کے برابر بھی نہیں ہیں۔ صرف یہ آرزو ہے کہ دنیا کے تمام خطوں میں رب العالمین کے احکام جاری ہو جائیں"۔

موجودہ دور کی تحریک اسلامی کا داعی یہ کہتا ہے:

"میرے لیے تو یہ تحریک عین مقصدِ زندگی ہے۔ میرا مرنا اور جینا اس کے لیے ہے۔ کوئی اس راہ پر چلنے کے لیے تیار ہو یا نہ ہو بہر حال مجھے تو اسی راہ پر چلنا اور اسی راہ میں جان دینا ہے۔ کوئی آگے نہ بڑھے گا تو میں بڑھوں گا۔ کوئی ساتھ نہ دے گا تو اکیلا چلوں گا۔ ساری دنیا متحد ہو کر مخالفت کرے گی تو مجھے تن تنہا اس سے لڑنے میں بھی باک نہ ہوگا"۔

تحریکِ اسلامی ایک نظام اخوت

ہر اسلامی تحریک اپنے اندر ایک ایسا نظام اخوت رکھتی ہے جو اس کے پیرووں کو ایک مضبوط بھائی چارے میں پرو کر بنیان مرصوص بنا دیتا ہے۔ باہم ایک دوسرے پر سلامتی اور رحمت بھیجنے کا معمول، ایک دوسرے کے چھینکنے پر رحمت کی دعا، باہمی دعوتیں دینا اور انہیں قبول کرنے کا اہتمام، بیماری میں ایک دوسرے کی عیادت اور غمخواری، جنازے میں شرکت کا التزام، ایک دوسرے کے لیے آئینہ کی مانند ہونا اور اس کے عیبوں سے اسے پوری ہمدردی اور محبت سے آگاہ کر کے اس میں خوبیاں پیدا کرنے کی کوشش کرنا، ایک دوسرے کے نقصان کو رفع کرنا۔ بہترین مخلصانہ مشورہ دینا۔ کسی کی غیر حاضری میں اس کے گھر کی حفاظت اور اس کے اہل و عیال کی خبر گیری کرنا۔ اپنے ہمسایوں کے حقوق کا لحاظ کرنا اور ان کی پوری

پوری نگہداشت کرنا۔اس کے مقابلے میں دوسری تحریکیں مادی مسابقت، مناصب کی کشمکش اور باہمی بے تعلقی اور بےنیازی پر مبنی ہوتی ہیں اور ان کے کارکنوں سے لے کر رہنماؤں تک، کسی میں بھی ایک دوسرے کے ساتھ مخلصانہ تعلق نہیں ہوتا۔یہی وجہ ہے کہ اسلامی تحریک ایک بدترین خودغرضانہ ماحول کے درمیان رہتے ہوئے بھی اپنے جماعتی نظام میں ایک ایسا برادرانہ خوشگوار ماحول پیدا کر دیتی ہے جو پیاسوں کے لیے چشمے کی مانند ٹھنڈا اور تپتے صحراؤں میں سایہ دار درخت کی مانند خنک، پرسکون اور روح افزا ہوتا ہے۔

تحریک کا طریق کار اسلامی تحریک کا طریق کار پُرامن جمہوری غیرخفیہ اور تدریجی ہوتا ہے۔ وہ معاشرے میں فساد برپا نہیں کرتی بلکہ فساد کو اصلاح سے بدلتی ہے۔ وہ عوام کو تبلیغ و تلقین سے اپنے نصب العین کی طرف بلاتی ہے اور معاشرے کے آئینی اور قانونی ڈھانچے کے اندر رہ کر علانیہ اصلاح کی دعوت دیتی ہے۔ اس میں جبر و تشدد کا شائبہ بھی نہیں ہوتا۔ایک ایک سوال اور اعتراض کا جواب دیا جاتا اور ہر شبہے کا ازالہ کیا جاتا ہے۔ وہ ذہنوں کو مطمئن کر کے دلوں کو اپیل کرتی ہے۔اس کا سارا کام معاشرے کی جمہوری سطح پر غیرخفیہ انداز میں کھلم کھلا انجام پاتا ہے۔اس میں سازش کے لیے کوئی جگہ نہیں ہوتی۔ یہ جمہوری اور دعوتی عمل تدریج سے آگے بڑھتا رہتا ہے۔یہی سبب ہے کہ افہام و تفہیم سے آئے ہوئے لوگ اپنے پورے اطمینانِ دل و دماغ کے ساتھ آتے ہیں اور پوری صلاحیتیں اور قوتیں اپنے ساتھ لاتے ہیں۔اسی طریقِ کار کا نتیجہ ہے کہ عرب میں جب یہ تحریک اپنی ۲۳ سالہ جدوجہد کے نتیجہ میں اسلامی انقلاب لائی تو اس ساری انقلابی جدوجہد کے دوران دوطرفہ جنگی کشمکشوں میں کام آنے والے افراد کی تعداد تاریخ کے ریکارڈ کی رو سے ۱۲۰۰ سے زائد نہیں ہے جبکہ فساد، جبر و تشدد اور خفیہ سازشوں کے ذریعے فوری تبدیلی لانے کی کوشش نے انقلابِ فرانس میں بیس پچیس لاکھ سے زائد افراد کی جان لی اور روس کے طبقاتی اشتراکی انقلاب میں تو ۷۰ لاکھ سے زائد سروں کی فصل اس طرح کٹی کہ شاید پوری انسانیت کی تاریخ میں ایسا خونی انقلاب کبھی نہ آیا ہوگا۔ اور اب بھی جہاں اشتراکیت آئے گی اپنے ساتھ خون خرابہ لائے گی

قوت کا سرچشمہ تحریک اسلامی کی قوت کا سرچشمہ مادی تحریکوں کے مقابلے میں تین گنا ہوتا ہے۔تحریک کی مادی قوت جو افراد کے ساتھ فراہم ہوتی ہے۔اس کی اخلاقی قوت جو اس کے شریفانہ باوقار اور پابندِ اخلاق طریق کار کے سبب اور کارکنوں کے صالح اور پاکیزہ کردار کے ذریعے اسے حاصل ہوتی ہے۔اور اللہ پر توکل اور اس کی غیبی امداد کا زبردست اعتقاد جو مومنین کے چھوٹے سے چھوٹے گروہ کو کفار کے

بڑے سے بڑے گروہ سے ٹکرا دیتا ہے اور کامیابی ان کے قدم چومتی ہے۔ پوری اسلامی تاریخ اس پر گواہ ہے کہ مادی بے سروسامانی کے باوجود دوسری دونوں قوتوں کا بھرپور خزانہ اس طرح اسلامی تحریک کی پشت پر ہوتا ہے کہ اس کی قوت میدانِ عمل میں کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔

مثالی ریاست کا تصور

تحریک اسلامی کی مثالی ریاست قانون کے سامنے مساوات پر شدت کے ساتھ زور دیتی ہے۔ مدینہ کی اسلامی ریاست میں حضرت کعبؓ بن مالک اور حضرت عمرؓ فاروق خلیفۃ المومنین کا مقدمہ عدالت میں جاتا ہے۔ اول تو دنیا کے لیے یہ بھی حیران کن خبر ہے کہ صدرِ ریاست ایک عام شہری کے خلاف مدعی بن کر عدالت میں جاتا ہے۔ اپنے اختیاراتِ خصوصی سے کسی شہری سے اپنا حق خود وصول نہیں کر لیتا بلکہ قانونی طریق سے عدالتی چارہ جوئی کرتا ہے۔ عدالت کا جج (حضرت زید بن ثابتؓ) خلیفۂ راشد کے احترام میں اٹھ کر کھڑا ہوتا ہے۔ بس یہی بات خلیفۃ المسلمین کی گرفت کے لیے کافی ہے۔ وہ کہتے ہیں "زید یہ پہلی بے انصافی ہے جو تم نے میرے معاملے میں میرے فریقِ مخالف کے ساتھ کی ہے"۔ ترقی کے اس دور میں بھی آج دنیا کی ساری سلطنتوں کے سربراہ قانونی چارہ جوئی اور عدالت کی حاضری سے مستثنیٰ ہیں۔ لیکن اسلامی ریاست کا سربراہ مدعی اور مدعا علیہ دونوں حالتوں میں حاضرِ عدالت ہونے کا پابند ہے اور شہریوں کے درمیان قانون کی نظر میں وہ برابر ہے۔

شہری حقوق کی پاسبانی میں اسلامی ریاست کے صدر کی پالیسی بہت واضح ہے۔ خلیفہ منتخب ہوتے ہی حضرت ابوبکرؓ صدیق شہریوں کے ایک اجلاس کو خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"تم میں جو قوی ہے وہ میرے نزدیک کمزور ہے جب تک کہ میں اس سے کمزور کا حق وصول نہ کر لوں اور تم میں سے جو کمزور ہے وہ میرے نزدیک قوی ہے جب تک میں اس کا حق نہ اسے دلوا دوں"۔

اسلامی ریاست کے صدر مملکت کا معیار زندگی حضرت عمرؓ نے خود ہی بتایا ہے:

"میں خود بتاتا ہوں کہ مجھے مسلمانوں کے بیت المال سے کتنا لینا چاہیئے۔ دو جوڑے کپڑے گرمی اور سردی کے لیے۔ سواری۔ متوسط گھرانے کے گھریلو اخراجات اور ایک ملازم، بس پھر میرا حال وہی ہے جو عام مسلمان کا ہے"۔

حالانکہ ترقی کے اس دور میں جب مساوات کے نعرے اور انسانی حقوق کے بلند بانگ دعووں سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ انگلستان کا بادشاہ تہتر لاکھ پچاس ہزار پونڈ سالانہ کے علاوہ اور بہت سے

دوسرے الاؤنس بھی حاصل کرتا ہے اور پھر بھی مزید اضافے کے لیے تجاویز بھیجتا رہتا ہے۔ اور امریکہ کا صدر سات کروڑ ڈالر سالانہ میں بھی گزارہ نہیں کر سکتا۔

مقصدِ اقتدار اسلامی تحریک کے لیے اقتدار تک پہنچنے کا جو مقصد خود اللہ کی طرف سے مقرر کیا گیا ہے وہ یہ ہے اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ یعنی اسلامی تحریک کے علمبردار وہ لوگ ہیں جنہیں اگر زمین میں اقتدار نصیب ہو تو وہ اللہ کا نظام عبودیت قائم کرتے ہیں جس کا بہترین نمونہ نماز ہے۔ وہ اللہ کا دیا ہوا معاشی انصاف کا نظام قائم کرتے ہیں جس کا بہترین نمونہ زکوٰۃ ہے۔ جہاں سود کے ذریعے مال غریبوں سے امیروں کی جیبوں تک نیچے سے اوپر نہیں کھینچا جاتا جس سے معاشرے کی جڑیں ہی خشک ہو کر رہ جائیں بلکہ زکوٰۃ کے ذریعے مالداروں سے غریبوں کی طرف اوپر سے نیچے اترتا ہے۔ وہ معاشرت و سیاست میں نیکی کی عملداری اور معروف کی برتری قائم کرتے ہیں اور برائی کا استیصال کر دیتے ہیں۔ یہ وہ نظام ہوتا ہے جس میں جاہلی تعصبات، علاقائی عصبیتوں، نفسانی فتنوں اور مفادات کے جھگڑوں کے لیے کوئی جگہ نہیں ہوتی۔ اقتدار کی قوت زندگی کے ہر گوشے میں برائی کی مزاحمت کرتی، اس کی پرورش کو روکتی، اس کے لیے عرصۂ حیات تنگ کرتی، اور اس کے امکانات کا خاتمہ کرتی ہے اور نیکی اور بھلائی کی پرورش میں اپنے سارے وسائل اور تمام تعلیمی تربیتی انتظامی اور قانونی اداروں کو لگا کر اسے معاشرے میں ایک قابل قدر اور قابل فخر شے بناتی ہے۔

مخالفتوں میں طرزِ عمل اسلامی تحریک کا اپنے مخالفین کے مقابلے میں بھی دنیا بھر سے انوکھا طرزِ عمل ہوتا ہے اور بالعموم یہ طرزِ عمل ہی لوگوں کے لیے اُس کی شناخت کا بہترین ذریعہ بن جاتا ہے۔ اس کے مخالفین اسے بدنام کرنے کے لیے الزامات، اتہامات، جھوٹ، افترا اور گالی گلوچ کا طوفان کھڑا کرتے ہیں، اور اس سارے گرد و غبار میں اس کی شرافت، اُس کا کردار اور اس کا عالی ظرفانہ طرزِ عمل اس کے چہرے کی چمک کو اور زیادہ نکھارتا چلا جاتا ہے۔

حضورؐ کا طرزِ عمل ہمیشہ صبر و شکر کا رہا۔ طائف میں بدترین ظلم و ستم کے مقابل بھی لبوں پہ دعا ئے رحمت ہی رہی۔ ظلم کی انتہا دیکھ کر پہاڑوں کے فرشتے نے اذنِ الٰہی سے پیش کش کی کہ اس بستی کو دونوں پہاڑوں کے درمیان پیس دیا جائے تو رحمۃ للعالمین نے زخمی اور مضمحل حالت میں بھی یہی فرمایا کہ "نہیں، شاید یہ نہیں تو ان کی اولادیں ہی اللہ پر ایمان لے آئیں"۔

حضورؐ ہی کے اُمتی اسلامی تحریک کے ایک علمبردار نے اپنے بدترین مخالفین کے روزمرہ ظلم و زیادتی کو دیکھ کر ہمارے اپنے دور میں اپنے ساتھیوں کو مخاطب کر کے کہا:

"آپ کسی حال میں مشتعل نہ ہوں۔ اپنی زبان اور مزاج پر قابو رکھیں اور جب کبھی اشتعال کی کیفیت ابھرتی محسوس کریں تو اسے نزغِ شیطانی سمجھ کر اللہ کی پناہ مانگیں۔ سخت سے سخت بیہودہ مخالفت میں بھی آپ حدود اللہ سے تجاوز نہ کریں۔ ہر لفظ جو آپ کی زبان سے یا قلم سے نکلے اس پر خوب سوچ لیں کہ وہ خلافِ حق تو نہیں ہے اور آپ اس کا حساب خدا کے ہاں دے سکیں گے۔ آپ کے مخالفین خدا سے ڈریں یا نہ ڈریں آپ کو بہر حال اس سے ڈرتے رہنا چاہیے۔"

تشدد کے مقابلے میں یہ تحریک ہمیشہ پُرعزیمت اور مضبوط، مخالفتوں کے طوفان کے مقابلہ میں ایک منظم اور با اصول گروہ، حملہ آوروں کے مقابلہ میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار، خوف و ہراس کی حالت میں نڈر اور بے خوف اور لوہے کے چنے کی مانند دندان شکن اور مخالفِ اسلام قوتوں کے مقابلے میں ناقابلِ شکست قلعہ ہوتی ہے جسے اپنے مقام سے نہ ہٹایا جا سکتا ہے اور نہ گرایا جا سکتا ہے۔

تنظیم کے چند بنیادی اصول

اسلامی تحریک کی تنظیم کے چند بنیادی اصول ہیں جو اپنی ساری وسعتوں کے ساتھ تحریک کے اندر رواں دواں رہتے ہیں اور ان کی موجودگی میں تحریک ایک فعال اور صحت مند اجتماعی ادارہ بن جاتی ہے جو اپنی منزل کی طرف مسلسل اقدام کرتی رہتی ہے۔

۱۔ سب سے پہلا اصول سمع و اطاعت ہے۔ یہاں جو شخص بھی کسی ذمہ داری کے منصب پر فائز ہو وہ اپنے ساتھیوں کو خدا سے ڈرتے ہوئے حکم دیتا ہے اور ساتھی بھی اسے کارِ ثواب سمجھتے ہوئے ہی بجا لاتے ہیں۔

۲۔ دوسرا اصول شورائیت ہے جس کے ذریعے مشورے کا اہتمام و انتظام تحریک کے ہر گوشے میں ہر سطح پر کیا جاتا ہے تاکہ اجتماعی ذمہ داری کا کام اجتماعی رائے سے سرانجام پاتا رہے۔

۳۔ تیسرا اصول محاسبہ اور باہمی خیر خواہی ہے۔ ایک زندہ ہمدرد اور صحت مند رجحانِ تنقید جو تحریک کی صحت کو بحال رکھتا ہے اور اس کے تمام کارکنوں کو خوب سے خوب تر کی طرف کھینچتا رہتا ہے۔

۴۔ چوتھا اصول باہمی محبت و اخوت و تعاون ہے جو اسلامی تحریک کی جان ہے جس کی مدد سے غیر اپنے اور مخالف دوست بن جاتے ہیں اور انفرادی قوت ہزاروں ساتھیوں کی قوت کے ساتھ مل کر ضربِ کلیمی

بن جاتی ہے۔

۵۔ پانچواں اصول ایثار و قربانی ہے جو تحریک کے لیے، ساتھیوں کے لیے اور خدا و رسولؐ کی رضا کے لیے کی جاتی ہے اور اس کی مقدار ہی ایک کارکن کے خلوص کا پیمانہ بن جاتی ہے۔

۶۔ چھٹا اصول اکثریت کے مقابلے میں انفرادی رائے کی قربانی ہے۔ اس سے اظہار رائے کی وہ آزادی برقرار رہتی ہے جو سب سے قیمتی چیز ہے مسائل طے کرنے میں سارے دلائل سامنے آجاتے ہیں جو رائے قائم کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ لیکن رکاوٹ کا باعث کوئی فرد نہیں بنتا۔ کیونکہ حق صرف کتاب و سنت میں پوشیدہ ہے اور تدابیر میں اجتماعی رائے ہی مسلّمہ سیدھا راستہ ہے۔

۷۔ ساتواں اصول باہمی عفو و درگزر اور وسعت قلبی ہے جس سے دوسروں کی کمزوریوں سے چشم پوشی اور دوسروں کی خوبیوں سے استفادے کا راستہ کھل جاتا ہے اور لوگ دوسروں کی غلطیاں چن چن کر مقدمہ تیار کرنے کے بجائے اپنی اپنی غلطیوں کی اصلاح پر لگ جاتے ہیں جس سے ساری تحریک میں اصلاح کا عمل کارفرما رہتا ہے اور بغض و حسد تو تکار اور تنگدلی کے جذبات سے ماحول پاک صاف رہتا ہے۔

ان اصولوں کی مدد سے تحریک اسلامی کی تنظیم ایک زندہ و متحرک، تندرست و توانا، مضبوط درخت کی طرح ہوتی ہے جس کی جڑ مضبوط، جس کا تنا سر بلند، جس کی شاخیں گھنی، جس کا سایہ خنک اور جس کا پھل خوشگوار ہوتا ہے اور وہ اپنے پرورش کرنے والوں کے لیے سراسر رحمت و برکت اور منافع کا کام ہوتا ہے۔

اسلامی تحریک کی چند بیماریاں اور ان کا علاج دنیا میں پائی جانے والی ہر چیز میں زوال و انحطاط کا عمل بھی پایا جاتا ہے جو مختلف کمزوریوں اور بیماریوں کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔ ان کا بروقت تدارک کر لیا جائے تو صحت برقرار رہتی ہے۔ اسلامی تحریک بھی اپنے مزاج کے اعتبار سے چند بیماریوں کی شکار ہو سکتی ہے اور اگر وہ زور پکڑ جائیں تو وہ تباہی و ہلاکت سے بھی دوچار ہو جاتی ہے۔ اس کی بیماریوں میں چند ایک کا تذکرہ بہت ضروری ہے۔

۱۔ سب سے پہلی بدنظمی ہے۔ بالعموم یہ بیماری تحریک میں اس وقت داخل ہوتی ہے جب افراد میں سمع و اطاعت کی جگہ نفس کی سرکشی زور پکڑنے لگتی ہے اور بعض افراد کا نفسِ متکبر کسی اجتماعی حکم کو اپنے اوپر تازیانے کی چوٹ کی مانند محسوس کرتا ہے اور حمیت ایمانی کی جگہ کوئی جاہلی عصبیت دل میں جھانکنے لگتی ہے اس بیماری کا فوری علاج انفرادی اور اجتماعی محاسبہ ہے۔ محاسبے کے بغیر چھپا ہوا چور برآمد نہیں ہوتا اور اندر

ہی اندر نفسِ انسانی میں نقب لگاتا رہتا ہے یہاں تک کہ بدتر نتائج تک جا پہنچتا ہے۔

۲۔ دوسری بیماری قنوطیت ہے جو کسی کارکن میں عزم و ارادے کی کمزوری سے نمودار ہوتی ہے۔ جب راہ حق کی مشکلات، سفر کی طوالت، اور منزل کی بظاہر دوری اور نظروں سے اس کا اوجھل ہونا کسی کارکن کو تھکا دیتا ہے تو وہ آگے بڑھنے کے بجائے تھک ہار کر مایوسی کی باتیں کرنے لگتا ہے قنوطیت شیطان کی وہ تلوار ہے جس سے وہ تھکے ماندے مومنین کے دلوں کو مجروح کر کے انہیں منزل کی طرف بڑھنے سے روکتا ہے اور بیٹھ رہنے یا واپس مڑ جانے پہ آمادہ کرتا ہے۔ اس کا علاج پیہم اور مسلسل تحریکی کام ہے۔ ساتھیوں کی رفاقت، ان کی باتیں ان کے عزائم اور صحابہؓ کرام کی پرصعوبت زندگیوں کا مطالعہ ہے۔

۳۔ تیسری بیماری خوف و ہراس ہے۔ یہ ضعفِ ایمانی کے باعث لاحق ہوتی ہے، جبر و تشدد کے ماحول میں پرورش پاتی ہے اور ملوکیت و آمریت کے سناٹے میں آکاس بیل کی طرح پھیل جاتی ہے۔ اس کا تریاق پوری قوتِ ایمانی سے کلمۂ حق کو بلند کرنا اور اذانِ دعوت حق سے اس سناٹے کو توڑنا اور جو کچھ بھی راہِ حق میں پیش آئے اسے جھیل جانا ہے۔

۴۔ چوتھی بیماری بے حسی ہے جو کام کو سامنے دیکھتے ہوئے بھی آدمی کو حرکت میں نہیں آنے دیتی اور خطرے کو سر پر دیکھ کر بھی اپنے آپ کو بچانے کے احساس سے محروم کر دیتی ہے۔ اس کا سبب نفسِ انسانی میں اسلامی شعور کی کمی، آخرت کی جوابدہی کے احساس کی کمی، اور دینی فہم و بصیرت کی کمی ہوتا ہے۔ اس کا علاج کارکنوں کی تربیت، مقصدِ جماعت اور افکارِ جماعت کی پیہم تذکیر، تنظیم کی کمزوریوں کو رفع کر کے اسے خوب کستے رہنا، اور معاشرے کے سارے گوشوں کو دعوتِ حق سے سیراب کرنے کے لیے دعوتِ عام کا ایسا منصوبہ بنانا ہے جس سے ہر کارکن اس میں مصروف ہو جائے۔ اس طرح معاشرے کا جمود بھی ٹوٹے گا اور کارکن کا شعور بھی بیدار ہو گا۔

۵۔ پانچویں بیماری عصبیتِ ایمانی کی کمی ہے۔ مادہ پرستی کے اس دور میں جب چاروں طرف معیارِ زندگی بلند کرنے کی دوڑ لگی ہوئی ہے اس بیماری کا عام وبا کی شکل اختیار کر لینا ایک فطری امر ہے۔ اس کا سبب حبِ مال اور اشیاء دنیا کی چاہت اور طلب ہے۔ اس کا حقیقی علاج تو صدقہ و انفاق میں اضافہ کرنا ہے۔ جس قدر صدقہ دیا جائے طلبِ مال اور معیارِ زندگی کے بلند کرنے کی حرص پہ چوٹ لگتی ہے۔

اور قناعت کی طرف طبیعت راغب ہوتی ہے۔اس کے لیے قرآن کی آیاتِ قیامت، احادیث میں باب الرقاق اور صحابہؓ کی پرعزیمت زندگیوں کا مطالعہ بھی مفید ہوتا ہے۔اس مقصد کے لیے تحریک کے ذمہ دار لوگوں کا بھی فرض ہوتا ہے کہ وہ دیکھتے رہیں کہ اس وقت تحریک میں کن کن امراض کا خطرہ پایا جاتا ہے۔ان کی نشان دہی اور ان کا تدارک کرتے رہنا نہایت ضروری ہوتا ہے۔

۶- چھٹی بیماری - حسد- سوءِ ظن اور پھر غیبت ہے۔جو اخلاقی ماحول میں چپکے چپکے پرورش پاتی ہے اور تنظیم کو گھن کی طرح اندر سے کھاتی چلی جاتی ہے۔اس سے دل پھٹ جاتے ہیں۔اس کا علاج بھی محاسبہ اور اپنی کمزوریوں کو سامنے رکھ کر محاسبۂ نفس ہے۔

کارکنوں کی صفات اسلامی تحریک کے کارکنوں میں بعض صفات کا پایا جانا اشد ضروری ہے ورنہ وہ اس کام کو سرانجام نہیں دے سکتے جس کے لیے اسلامی تحریک برپا ہوتی ہے۔میں تفصیلی صفات کو نظر انداز کر کے اختصار کے ساتھ صرف چند مجمل صفات کی نشاندہی ضروری سمجھتا ہوں۔

۱- سب سے پہلی صفت محبتِ دین ہے۔اس میں کارکن کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے اندر خود اس بات کا جائزہ لیتا رہے کہ اسے دین اور اس کی سربلندی دنیا کی ہر شے سے زیادہ محبوب و عزیز ہو۔اس کے دل میں ایک میزانِ عدل نصب ہو جس میں وقتاً فوقتاً وہ اپنی محبت و انس کی دعویدار ہر شے کو نکال کر تولتا رہے کہ اس کا وزن دین کے مقابلے میں کتنا ہے۔جس شے کو ذرا بھی دین سے بڑھتے ہوئے محسوس کرے اس کے پیچھے پڑ کر بھی اسے دین کے مقابلے میں لپیٹ کرے۔اس تول میں کوئی فرد، کوئی ہستی اور کوئی شے بھی نہ چھوڑی جائے جو بھی محبت کا دعویدار بن کر اٹھے اسے اس ترازو میں ڈالا جائے تاکہ وہ اپنے حقیقی مقام پر رہے۔یہ کام وقتاً فوقتاً ہوتا رہے اور دین کے مقابلے میں ہر دنیوی شے کی محبت کو پست رکھنے کا اہتمام جاری رہے۔

۲- دوسری صفت معرفتِ دین ہے۔یعنی جس شے سے محبت ہے اس کی شناخت اور پہچان، قرآن و سنت کا علم اور اس پر عمل پیرا ہونے والوں کے طرزِ عمل اور کردار سے آگاہی۔اس معرفت کا مثبت پہلو دین کو ہمہ پہلو جاننا بھی ہے اور اس کا منفی پہلو خلافِ دین فکری تحریکوں اور ان کی تفصیلات سے آگاہی بھی ہے تاکہ ایک طرف تحریک کا کارکن دین کی صراطِ مستقیم سے آگاہ ہو اور دوسری طرف دین سے دور لے جانے والے فکری اور عملی راستوں سے بھی آگاہ رہے اور دھوکا نہ کھا سکے۔اس معرفت کے

بغیر آدمی کی حیثیت اس رہرو کی سی ہوتی ہے جو اندھیرے میں روشنی کے بغیر چلا جا رہا ہو۔ ہو سکتا ہے کہ وہ سیدھے راستے پر ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ کسی وقت غلط راستے پر پڑ جائے اور پھر اپنی بے خبری میں غلط راستے پر ہی آگے نکلتا چلا جائے۔

۳۔ تیسری صفت حمیتِ دین ہے۔ یہ صفت ایک کارکن کو مجاہد بناتی ہے اور اسے دین کے لیے سینہ سپر ہونا سکھاتی ہے۔ اسے نہ دین کی رسوائی گوارا ہوتی ہے اور نہ اس کی ذلت برداشت ہوتی ہے۔ جس طرح کوئی باغیرت بیٹا اپنے سفید ریش باپ کو سربازار رسوا ہوتے دیکھنا پسند نہیں کرتا اسی طرح ایک باغیرت دینی کارکن اپنے دین کو بھی سربازار رسوا اور ذلیل و خوار دیکھنا پسند نہیں کرتا۔ دین پر حملہ ہو تو وہ اس کا دفاع کرتا ہے۔ دین کے خلاف فتنے اٹھیں تو وہ تڑپتا ہے۔ دین کی خلاف ورزیاں ہوں تو وہ بے چین ہوتا ہے۔ دین کی جڑیں اکھاڑی جائیں تو وہ مضطرب ہوتا ہے اور دین کے ہمہ پہلو دفاع کے لیے وہ ہر وقت تیار رہتا ہے۔ دین کے دشمنوں کی سرگرمیوں پر نظر رکھتا ہے۔ مخالفِ دین افکار و نظریات سے بھی آگاہ ہوتا ہے اور دین کے حق میں ہر ممکن فکری ہتھیار سے لیس رہتا ہے تاکہ دین کے مخالفوں سے ہر ہر عملی اور فکری مورچے پر لڑ سکے۔

۴۔ چوتھی صفت استقامت فی الدین ہے۔ یعنی دین کے راستے میں پامردی۔ استقلال اور عزیمت کا مظاہرہ۔ یہ راستہ کٹھن بھی ہے اور دشوار گزار بھی جسے ایک دیندار آدمی اقامتِ دین کے لیے اختیار کرتا ہے۔ دین کے راستے پر چلنا باطل کے تحت دنیا کے بہت سے مفادات سے دست برداری کے مترادف ہے۔ بہت سی دل پسند چیزوں سے محرومی ہے۔ بہت سی لذاتِ نفس سے علیحدگی ہے۔ پھر آدمی کی دنیا سے وابستہ بہت سے ہمدرد اس کی دنیوی کامیابیوں کے لیے کوشاں ہوتے ہیں اور اسے جائز و ناجائز کی تشویش میں مبتلا دیکھ کر پریشان ہوتے اور پریشان کرتے ہیں۔ معیارِ زندگی کی دوڑ میں مصروف اہل خانہ اندرونی تقاضوں کا ندر صرف کرتے ہیں۔ بیرونی دباؤ پڑتے ہیں۔ رزق کے محدود وسائل پر بھی حملے ہوتے ہیں۔ معاشرہ ناک میں دم کر دیتا ہے۔ عزیز و اقرباء کا دباؤ پڑتا ہے۔ نظام باطل ہر طرف سے سکیڑتا اور بھینچتا ہے اور کارکن کے لیے اپنے مقام پر پاؤں جمائے کھڑے رہنا مشکل کر دیا جاتا ہے۔ پھر باطل کے خلاف دین کی سربلندی کی جدوجہد شیطان اور اس کے ہمنواؤں کو انتہائی ناگوار ہوتی ہے۔ وہ آزمائشیں کھڑی کر دیتے ہیں۔ قید و بند تک نوبت آسکتی ہے۔ آلام کے ان سب طوفانوں میں مردانہ وار ڈٹے رہنے سے ہی وہ صفت پیدا ہوتی ہے جو دینِ

حق کی پشت پناہی کرنے والے سپاہی کے اندر مطلوبہ صفت ہے۔ پے در پے آزمائشوں کی لہریں آتی ہیں اور مردِ حق کو پاؤں سے اکھاڑنا چاہتی ہیں لیکن دین اپنے پیروؤں سے لازماً ان قربانیوں کا مطالبہ کرتا ہے جو اس راہ میں مطلوب ہیں۔ یہ قربانیاں استقامت اور پامردی سے ہی دی جاسکتی ہیں۔

۵۔ پانچویں صفت مسابقت فی الدین ہے۔ دنیوی زندگی کے کسی معاملے میں بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ رشک کے ساتھ مقابلہ اور مسابقت کرنا پسندیدہ فعل نہیں ہے سوائے دین کے راستے کے، اس لیے کہ یہ خیر کا راستہ ہے اور اس راستے کے لیے فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ کا حکم ہے۔ حضورؐ نے جنگِ تبوک کے موقع پر مال طلب کیا تو کوئی صحابی نصف مال لے آئے اور کوئی خدا اور رسولؐ کا نام اہل خانہ کے لیے چھوڑ کر باقی سارا اثاثہ اٹھا لائے۔ نیکی کے راستے میں سبقت کرنے سے ہی تاریخ کی پُرعزیمت مثالیں قائم ہوتی ہیں جو بعد میں آنے والی نسلوں کے لیے جذبہ و جوش پیدا کرنے والی جذبہ انگیز مثالوں کی حیثیت سے کام دیتی رہتی ہیں۔ ایسی ہی مثالیں ہوتی ہیں جو صدقۂ جاریہ کی حیثیت اختیار کر لیتی ہیں اور انہیں دیکھ دیکھ کر نیکی و ایثار و قربانی اور جہاد فی سبیل اللہ کے پُرجوش جذبات بھڑکتے رہتے اور راہِ حق کو درخشاں نمونوں سے پُررونق بناتے رہتے ہیں یہی تو ایک راہ ہے جس میں مومن کا مومن سے مقابلہ ہونا چاہیے اور ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے کی کوشش کرنی چاہیے اور جو جس قدر آگے بڑھ جاتا ہے اس میں اسی قدر ایک اعلیٰ کارکن کی صفت نمودار ہوتی ہے اور قافلۂ تحریک میں اس کا مرتبہ اُسی قدر بلند ہو جاتا ہے۔

واحد کامیاب تحریک تاریخ کے اسٹیج پر ان خدوخال اور نشان ہائے شناخت کے ساتھ نمودار ہونے والی اسلامی تحریک کبھی ناکام نہیں ہوتی۔ چونکہ یہ انسانیت کی فلاح کا راستہ ہے۔ یہ بنی نوع انسان کے لیے روشنی کا مینار ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کوئی مخصوص قوم فلاح کا راستہ پانے میں ناکام ہو جائے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ لوگ اپنی بے بصیرتی سے روشنی کا مینار دیکھ نہ سکیں۔ لیکن یہ دراصل اس قوم کی ناکامی ہے۔ جو اسلامی تحریک کی راہِ فلاح کو پا نہیں سکتی اور تاریخ کی شاہراہ پر بدقسمتی کے دھکے کھاتی چلی جاتی ہے۔ ورنہ اسلامی تحریک کے لیے تو صرف کامیابی ہی مقدر ہے اس کی کامیابی کا ایک سبب یہ بھی ہوتا ہے کہ یہ ایک بے لوث اور بے غرض جدوجہد ہوتی ہے جس میں پیشِ نظر رضائے الٰہی کے حصول کے سوا اور کوئی دنیوی مفاد نہیں ہوتا، جبکہ دوسری تحریکوں کے پیشِ نظر نفسانی خواہشات، عہدہ و منصب اور خواہشِ اقتدار ہوتی ہے۔ اس کی کامیابی کا دوسرا سبب یہ ہوتا ہے کہ یہ بگاڑ کے بجائے اصلاح کی تحریک ہوتی ہے اور فطرتِ انسانی بگاڑ کے بجائے اصلاح کو ہمیشہ پسند کرتی ہے۔ اور اس کام میں تعاون کرنا کارِ خیر

سمجھتی ہے۔ تیسرا سبب یہ ہوتا ہے کہ دوسری تحریکیں صرف مادی اسباب پر بھروسہ کرتی ہیں جیسے قریش کو تھا، لیکن اسلامی تحریک اللہ کی غیبی مدد پر بھروسہ کرتی ہے جو اس کی اخلاقی و روحانی قوت میں زبردست تقویت کا باعث ہوتا ہے جیسے اصحاب بدر کو تھا۔ وہ اپنے محدود سروسامان کے ساتھ میدان میں نکل آئے تھے اور باقی جو کچھ کمی تھی اسے پورا کرنے کے لیے دستِ قدرت کے حوالہ کر دیا تھا۔ ایسا ہی موقع ہوتا ہے جب مومنین کی پشت پر ایک زبردست ہاتھ ان کی ڈھال بن کر نمودار ہوتا ہے جو باطل کی کمر توڑ دیتا ہے اور خدا کی آواز پکار پکار کر مومنین سے کہتی ہے:

لَا تَہِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ۔ — سست نہ پڑو۔ غم نہ کھاؤ۔ تمہی غالب ہو گے اگر تم مومن ہو۔

تحریکِ اسلامی کو پہچاننے اور شناخت کرنے کے لیے میں نے اس کے یہ چند خدوخال درج کر دیے ہیں تاکہ جاننے والے تو جانتے ہی ہیں، نہ جاننے والے بھی جان لیں کہ جب تحریکِ اسلامی کسی معاشرے میں موجود ہوتی ہے تو اسے پہچاننا اور اپنے ایمان کے تقاضوں کے مطابق اس کے ساتھ تعاون کرنا مومنین کا اولین فریضہ ہوتا ہے۔

(بقیہ اشارات) ہوتا ہے۔ اور معاشرے کی تنظیم کے لیے کسی قوم کو قانونی جکڑ بندیوں سے کافی حد تک بے نیاز کر دیتا ہے۔ چنانچہ دیکھئے جو قومیں بھی اپنی اخلاقی اقدار اور روایات کا احترام کرتی ہیں اُن کے اندر جمہوریت نشوونما پاتی ہے اور جن قوموں پر آمریت مسلط کرنا مقصود ہوتا ہے اُن کے اندر مروجہ اخلاقی اقدار اور روایات کو برباد کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جرمنی میں ہٹلر کا عروج اس کی نہایت واضح مثال ہے۔ مارٹن لوتھر نے مسیحیت کا جو نیا تصور پیش کیا اس سے لوگوں میں اس مذہب کی اخلاقی اقدار اور روایات کو پامال کرنے کا شدید رجحان پیدا ہوا۔ مذہب کے اس "مصلح" نے اصلاح کے نام پر مسیحیت کی عمارت کو ڈھا تو دیا مگر اس کی جگہ نئی اخلاقی اقدار اور نئی روایات کا کوئی ایسا ڈھانچہ تعمیر نہ کر سکا جو انسان کے اندر موجود شوریدہ سر اور سرکش انسان کو مہذب اور اخلاقی ضابطے کا پابند بنا سکتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اندر کے بپھرے ہوئے انسان کو کسی نظم کا پابند بنانے کے لیے بے رحم جکڑ بندیوں کا سہارا لینا پڑا۔ ظاہر بات ہے یہ کام کسی بے رحم آمر مطلق کے ہاتھوں ہی سرانجام پا سکتا تھا جو ہٹلر کی صورت میں جرمنی کی سرزمین میں نمودار ہوا۔

اس کے ساتھ ہی ملتا جلتا تخریب کا ایک تیسرا رجحان جو ہر آمر کے اندر بآسانی دیکھا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ ملک کے معاشی، معاشرتی اور تعلیمی نظام اور عدل و انصاف کے اداروں اور انتظامیہ کے مختلف شعبوں کو "اصلاحات" کے نام پر تعمیر نو کا کوئی واضح منصوبہ تیار کیے بغیر تہ و بالا کر دیا جائے تاکہ زندگی کے ہر شعبے میں شدید خلفشار رونما ہو جائے اور اس خلفشار کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں جب لوگوں کو اُمید کی کوئی کرن دکھائی نہ دے رہی ہو تو وہ مایوسی کے عالم میں ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ جائیں اور آمر اُن کی اس بے بسی اور بے کسی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہیں اپنے تیار کردہ نظام استبداد میں بڑی آسانی کے ساتھ جکڑ دے۔

جو لوگ "اصلاحات" کے نام پر زندگی کے مختلف شعبوں کو آمریت کے تسلط کی خاطر بے تکلف زیر و زبر کرتے رہتے ہیں وہ اپنی اس روش کو جائز ثابت کرنے کے لیے بڑی سادگی اور معصومیت سے یہ کہتے ہیں کہ جب تک کسی بوسیدہ نظام کو مسمار نہ کیا جائے اس وقت تک تعمیر نو کی کوئی صورت ممکن نہیں ہو سکتی۔ یہ دلیل سراسر

ایک منطقی مغالطہ ہے۔ اس میں سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ اخلاقی اقدار و روایات اور اجتماعی زندگی کے دوسرے شعبوں کو خواہ اُن کا تعلق عدلیہ اور انتظامیہ سے ہو یا معیشت، معاشرت اور سیاست سے، چونے، گارے اور اینٹوں کی عمارت پر قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے۔ عمارت تو ایک مدت گزرنے کے بعد بوسیدہ ہو جاتی ہے اس لیے اسے مسمار کر کے اس کی جگہ دوسری عمارت تعمیر کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے مگر اخلاق و روایات کے نظام اور معاشرتی، معاشی اور سیاسی ڈھانچوں کو کبھی یہ ضرورت پیش نہیں آتی کہ انہیں بیخ و بُن سے اکھاڑ کر اُن کی جگہ یکسر نئے نظامہائے حیات اور بالکل نئے معاشرتی، معاشی اور انتظامی ڈھانچے معرضِ وجود میں لائے جائیں کیونکہ یہ نظام اور ڈھانچے پورے کے پورے کبھی از کار رفتہ اور بوسیدہ نہیں ہوتے۔ یہ انسان کی صدیوں کی کوششوں کے ثمرات ہوتے ہیں جن کی بربادی ہمیشہ نقصان کا باعث ثابت ہوتی ہے۔ پھر یہ بات بھی عملاً ناممکن ہے کہ معتقدات و تصورات اور اخلاق و روایات کے نظام کو یکسر نیست و نابود کر دیا جائے۔ حیات انسانی کے ان گوشوں میں بلاشبہ انتشار تو پیدا کیا جا سکتا ہے۔ مگر انہیں بالکل فنا نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ان کا تعلق ان معتقدات، تصورات اور احساسات سے ہوتا ہے جن کے اندر تبدیلی تو لائی جا سکتی ہے مگر ان کا مکمل خاتمہ نہیں ہو سکتا۔ اس لیے جو فرد یا گروہ ان کے اندر مناسب اصلاح کرنے کے بجائے انہیں بالکل برباد کرنے کے درپے ہوتا ہے وہ درحقیقت قوم کو شدید خلفشار میں مبتلا کرتا ہے۔

بالفرض اگر نظامِ حیات کو عمارت پر قیاس بھی کر لیا جائے تو پھر بھی ان آمروں کی "اصلاحی سرگرمیوں" کو کسی لحاظ سے بھی قوم کے لیے مفید اور کارآمد نہیں کہا جا سکتا۔ کسی عمارت کو جس میں کوئی خاندان رہائش پذیر ہو اُسے اسی وقت ڈھایا جاتا ہے جب اس خاندان کے سامنے عمارتِ نَو کا کوئی واضح نقشہ موجود ہو اور اس کی تکمیل کے لیے اس کے پاس مناسب وسائل بھی ہوں۔ جو لوگ بغیر کسی متبادل نقشے اور منصوبے اور وسائل کے عمارت کو مسمار کرنا شروع کر دیتے ہیں ان کا مقصد ان کے مکینوں کو ہراساں اور پریشان کر کے انہیں جبراً بے دخل کرنا یا ان سے من مانی شرائط منوانے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا۔ قریب قریب اسی ناپاک عزم کے ساتھ آمر رائج الوقت نظام پر ضربیں لگاتا ہے۔ وہ اصلاح احوال کے لیے کوئی جامع اور قابل عمل منصوبہ تیار کیے بغیر مروجہ نظام کو بالکل درہم برہم کر کے رکھ دیتا ہے تاکہ عوام پر سراسیمگی اور پریشانی کا عالم طاری ہو اور وہ یا تو کسی کونے میں دبک کر بیٹھ جائیں یا آمر کے سامنے تسلیم و رضا

کی تصویریہ بن کر زندگی بسر کرنے کا عہد کر لیں۔

اسے قدرت کا عجوبہ کہیئے یا کرشمہ کہ اس نے اگر ایک طرف آمروں کے عزائم اور رجحانات میں حالات اور زمانے کے اختلاف کے باوجود یکسانیت پیدا کی ہے تو دوسری طرف اُن کے مزاج اور طرزِ عمل کو بھی کافی حد تک یک رنگ بنایا ہے۔ جذباتیت، لاابالی پن، دروغ گوئی، خودسری، لاف زنی، سنگدلی، طبیعت میں ناہمواری اور غصیلا پن یہ وہ عام صفات ہیں جو ہر آمر میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ جذباتیت اور لاابالی پن سے وہ دو مختلف نوعیتوں کے کام لیتا ہے۔ ایک یہ کہ وہ اپنے مصنوعی طرزِ عمل سے بسا اوقات عوام کو یہ تاثر دینے کی کوشش کرتا ہے کہ وہ مزاج اور جذبات کے لحاظ سے اُن کے بہت قریب ہے بلکہ ان کی سطح پر ہے اس لیے انہیں چاہیئے کہ وہ اسے اپنے حلقے کا ہی ایک فرد سمجھ کر اُس سے محبت کریں۔ دوسرے یہ کہ اس کی اس جذباتیت اور لاابالی پن سے ملک میں بے یقینی کی فضا قائم کرنے میں مدد ملتی ہے اور ہر شخص اور گروہ خوف زدہ رہتا ہے کہ معلوم نہیں کل اس کا کیا حشر ہو۔ دروغ گوئی اور لاف زنی سے عوام کے اندر آمر کا جھوٹا وقار قائم ہوتا ہے اور وہ ایک طلسماتی شخصیت کی حیثیت سے لوگوں کے دل و دماغ پر قبضہ کرتا ہے۔ اس کی سنگدلی اور غصیلے پن کی بنا پر عوام کے اندر دہشت پھیلتی ہے اور ہر فرد اپنی جگہ پر خوف زدہ رہتا ہے کہ کب اس کی شامت آجائے۔

مطبوعات

اسلام اور مغرب کے تہذیبی مسائل	مؤلف سید قطب شہید۔ مترجم ساجد الرحمٰن صدیقی۔ ناشر ادارہ معارفِ اسلامی کراچی کتابت طباعت عمدہ۔ صفحات ۲۰۸۔ قیمت دس روپے۔

زیرِ تبصرہ کتاب سیّد قطب شہید کی عربی تالیف "الاسلام و مشکلات الحضارۃ" کا اردو ترجمہ ہے۔ سید قطبؒ نے اس کتاب میں بتایا ہے کہ دورِ جدید میں نام نہاد تہذیب و تمدن نے انسان کو کن مسائل سے دوچار اور کن مشکلات میں مبتلا کر دیا ہے نیز یہ کہ اس تہذیب کا لبادہ اوڑھنے کے بعد کیا انسان، انسان بھی رہتا ہے یا نہیں۔ مغربی معاشرت کے بارے میں سنے سنائے نہیں بلکہ چشم دید حقائق کی بناء پر فاضل مؤلف اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ موجودہ بے خدا تہذیب کے جن پہلوؤں کو روشن سمجھا جاتا ہے وہ اپنی اصلیت میں قرونِ مظلمہ کے انسان کی زندگی سے کچھ کم تاریک نہیں۔

مباحث ایک نظر میں یہ ہیں ——— انسانیت کی تباہی، انسان کی حقیقت سے ناواقفیت، گمراہی اور اضطراب، انسان کی فطرت اور اس کی صلاحیت، مغربی معاشرت میں عورت کا مقام، اجتماعی اور معاشی نظام، انسان دشمن تہذیب، فطرت کا انتقام اور راہِ نجات ——— آخری باب میں سید قطب نے اس حقیقت کی نشاندہی کی ہے کہ آج کے انسان کی مشکلات صرف اسلام ہی کے زندگی سے متعلق بنیادی تصورات کو اپنانے سے دور ہو سکتی ہیں اور اس راہِ نجات سے انحراف کر کے تباہی و بربادی کے مہیب غاروں میں گرنے کے سوا اسے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔

ساجد الرحمٰن صدیقی صاحب کا ترجمہ خوب ہے البتہ کہیں کہیں پیرایۂ اظہار معیار سے گر گیا ہے اور مفہوم غیر واضح اور دقیق سا ہو گیا ہے۔

ہماری رائے میں اسلام اور مغرب کے تہذیبی مسائل کا مطالعہ جدید تعلیم سے بہرہ ور ہر اُس شخص کے لیے ضروری ہے جو تہذیبِ مغرب کے "چہرۂ روشن" سے کچھ بھی متاثر ہے تاکہ اُس پر اس کا "تاریک تر باطن" آشکار ہو سکے۔

نمبر شمار	نام کتاب	اعلیٰ ایڈیشن (روپے پیسے)	سستا ایڈیشن (روپے پیسے)
۳۶	اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے؟	.. ..	..،۵۰
۳۷	انسان کے بنیادی حقوق	..،۶۰	.. ..
۳۸	اسلام کا نظامِ حیات	۱،..	.. ..
۳۹	شہادت امام حسینؓ	..،۶۵	.. ..
۴۰	ذمیوں کے حقوق	.. ..	..،۵۰
۴۱	مرتد کی سزا اسلامی قانون میں	۱،۲۵	.. ..
۴۲	قادیانی مسئلہ	۲،۹۰	.. ..
۴۳	مسئلۂ قومیت	۳،۵۰	.. ..
۴۴	ہمارے داخلی و خارجی مسائل	۱،۱۰	.. ..
۴۵	اسلامی نظام اور مغربی لادینی جمہوریت	.. ..	..،۴۰
۴۶	معاشیاتِ اسلام	۱۰،۵۰	۶،۷۵
۴۷	اسلام اور جدید معاشی نظریات	۴،..	.. ..
۴۸	انسان کا معاشی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل	.. ..	..،۵۰
۴۹	اسلامی نظمِ معیشت اور اس کے اصول و مقاصد	.. ..	..،۲۵
۵۰	قرآن کی معاشی تعلیمات	۱،۲۵	.. ..
۵۱	حُرمتِ سُود	.. ..	..،۶۰
۵۲	مسئلۂ ملکیتِ زمین	.. ..	..،۲۵

نمبر شمار	نام کتاب	اعلیٰ ایڈیشن (روپے پیسے)	سستا ایڈیشن (روپے پیسے)
۵۳	اسلام اور عدلِ اجتماعی	.. ..	..،۴۰
۵۴	اسلامی تہذیب اور اُس کے اصول و مبادی	۸،۵۰	.. ..
۵۵	پردہ	۸،..	.. ..
۵۶	حقوق الزوجین	۴،۵۰	.. ..
۵۷	اسلام اور ضبطِ ولادت	.. ..	۱،۵۰
۵۸	مسئلۂ تعدد ازواج	۱،..	.. ..
۵۹	مسلم خواتین سے اسلام کے مطالبات	.. ..	..،۴۰
۶۰	تحریکِ آزادیٔ ہند اور مسلمان حصہ اول	۱۳،۲۵	۷،۷۵
	〃 〃 〃 حصہ دوم	۱۳،۷۵	.. ..
۶۱	تنقیحات	۷،۷۵	۳،۲۵
۶۲	اسلام، سرمایہ داری اور اشتراکیت	..،۹۰	.. ..
۶۳	تعلیمات	۵،..	.. ..
۶۴	اسلامی نظامِ تعلیم	..،۸۵	.. ..
۶۵	عالمِ اسلام کی تعمیر میں مسلمان طلبہ کا کردار	.. ..	..،۴۵
۶۶	جماعتِ اسلامی کا مقصد، تاریخ اور لائحہ عمل	۱،۵۰	۱،..
۶۷	سلامتی کا راستہ	.. ..	..،۸۰
۶۸	سُود	۹،۵۰	

۳۱۱-۴۵

اُردو تصانیف (علاوہ تفہیم القرآن) کے مکمل سیٹ پر انفرادی خریدار کو دس فیصد رعایت اور ڈاک خرچ بذمہ ادارہ ہوگا۔

قیمت (مکمل سیٹ) ۳۱۱-۴۵ —— رعایتی قیمت ۲۸۰-۳۰

انگریزی تصانیف کے مکمل سیٹ پر انفرادی خریدار کو دس فیصد رعایت اور ڈاک خرچ بذمہ ادارہ

قیمت (مکمل سیٹ) ۱۰۷-۲۵ —— رعایتی قیمت ۹۶-۵۵

اُردو اور انگریزی تصانیف کے سیٹ منگانے پر انفرادی خریدار کو بیس فیصد رعایت

قیمت (اردو و انگریزی) ۴۱۹-۷۰ —— رعایتی قیمت ۳۳۵-۷۵

ان کے علاوہ اسلامک پبلیکیشنز کی جملہ مطبوعات بھی مہیا کی جا سکتی ہیں

ادارہ ترجمان القرآن، اچھرہ - لاہور